چکّر
جتیندر بلّو

(افسانے)

جتیندر بلّو

قلم پبلی کیشنز، ممبئی

نام کتاب : چکّر
مصنف : جتیندر بلّو
طبعِ اول : مارچ ۲۰۰۷ء
قیمت : ۲۰۰/روپے بیرون ملک دس برطانوی پونڈ
سرورق : فیصل صدیقی
ناشر : الیاس شوقی

Chakker

A Collection of Short-stories

by

JATINDER BILLOO

مصنف کا پتہ 6 Corfton Lodge, Corfton Road , EALING , **LONDON W5 2HU.**

Tel: 020 8998 0185 **Mobile: 07787842541**

تقسیم کار : ☆ **قلم پبلی کیشنز** :
۱۷/۱۷، ایل، آئی، جی، کالونی، کرلا (مغربی) ممبئی ۷۰
مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ: ممبئی، دہلی، علی گڑھ
☆**سیفی بک ایجنسی**
امین بلڈنگ، ابراہیم رحمۃ اللہ روڈ، نزد جے جے ہسپتال جنکشن، ممبئی ۳
(بھاوے پرنٹنگ پریس ممبئی ۸ میں طبع ہوئی)

انتساب

اردو ادب میں جب مجھے دوُر دوُر تک کوئی ایسی شخصیت دکھائی نہ دی جس کے نام مَیں اپنا تازہ افسانوی مجموعہ معنون کر پاتا تو میں نے اپنے ناشر اور نہایت قریبی دوست الیاس شوقی کو لکھا کہ وہ میری اِس کتاب کو بغیر انتساب کے شائع کر دے۔ یوں بھی مَیں اس فرسودہ روایت کے حق میں کبھی نہ رہا تھا۔ لیکن اُس شام مَیں مرکزی لندن کی ایک پَب (PUB) سے لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا تو چند ہاتھوں نے مجھے تھام کر اپنی گرفت میں لے لیا۔ دیکھا تو اس عہد کے سب سے عظیم نظم گو اختر الایمان کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ان کے ساتھ موجودہ اور آنے والے دور کے سب سے بلند قامت افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی بھی تھے۔ اُن کے ساتھ ایک تیسرا شخص بھی تھا، جس کی صورت سے میں آشنا نہیں تھا۔ بیدی صاحب نے بتایا یہ یگانہ چنگیزی ہیں، جن کی شاعری میں تلخ اور داخلی سچائیاں پا کر تم جھوم اُٹھا کرتے تھے۔ مَیں سراپا اُن سب کے آگے جھک گیا۔

میں اپنی کتاب ''چکر'' اِن عظیم ہستیوں کو سلوٹ کرتا ہوا ان کے نام معنون کرتا ہوں۔

لندن ۲۸ر نومبر ۲۰۰۶ء

جتیندر بلّو

فہرست

''ملائکہ! میری آواز سن رہے ہو تُم''

(اختر الایمان)

ایک عام رسالے کی تو بات ہی جانے دیجیے۔ لیکن جب اوراق اور فنون جیسے معیاری اور معتبر رسائل کے ابتدائی صفحات حمد و نعت سے پُر ہوں تو مجھ جیسا اردو کا غیر مسلم ادیب جو زندگی کے ہر شعبے میں CO-EXISTENCE میں ٹھوس یقین رکھتا ہے اور مزاجاً صلح کُل بھی ہے، اپنی آتما کی گہرائیوں تک چونک اُٹھتا ہے کہ اردو زبان تو مشرف بہ اسلام ہوتی جارہی ہے۔ فنون کے مدیرِ اعلیٰ محترم احمد ندیم قاسمی ایک بلند پایہ افسانہ نگار، شاعر، صحافی اور خاکہ نویس تھے۔ وہ تقسیم ہند سے قبل اور بعد میں بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ وہ اپنی سوچ میں تحریک کے اعلیٰ مقاصد کے واسطے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری ہونے کے ناتے وہ فنون میں ترقی پسند ادب کو شائع کر کے تحریک کے مقاصد کو برابر فروغ دیتے رہے۔ وہ بھی ہر سوشلسٹ اور ہر سرخے کی طرح انقلاب کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ (مَیں بھی سرخ انقلاب کا دیوانہ تھا۔ ہر نوجوان کی طرح دن رات خواب دیکھا کرتا تھا۔ لیکن برلن دیوار کے انہدام پر میرے تمام خواب چکنا چور ہو کر رہ گئے اور مَیں سرمایہ دارانہ نظام کی زبردست قوت پر رشک کرنے

لگا۔ مگر دنیا یہاں ختم نہیں ہوتی۔ دنیاوی حالات بدلنے میں دیر نہیں لگا کرتی۔ سیاسی، معاشی، طبقاتی اور اقتصادی حالات اوپر نیچے ہوتے ہی عوام کی سوچ بھی بدل جایا کرتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ سرخ سویرا کسی موڑ پر کھڑا ہمارے انتظار میں ہو۔) لیکن قاسمی صاحب جیسے ترقی پسند ادیب کے ہاں ایک عظیم تبدیلی پا کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ ایک مرتبہ پھر سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ واقعی مجھے اردو زبان میں لکھنا چاہیے یا نہیں، یہ قلمبند کرنا اس لیے ضروری ہو گیا ہے کہ زبان تو عوام کی ہوا کرتی ہے، خواہ اُن کا مذہب کچھ بھی رہا ہو۔ پھر زبان کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوا کرتا۔ اس کا سماج ضرور ہوتا ہے اور اس کا کام لوگوں کو الگ کرنا نہیں، بلکہ جوڑنا ہوتا ہے۔ بیک وقت یہ خیال بھی ڈھارس دیتا رہا کہ اردو تو مخلوط زبان ہے۔ ہندوستان کے چوٹی کے ماہرِ لسانیات، خوش بیان مقرر اور نقاد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مطابق:

> ''اردو زبان کی بنیاد پراکرت یعنی کھڑی بولی پر رکھی گئی ہے۔ البتہ اُس کی لفظیات کا امتیازی حصہ عربی فارسی سے آیا ہے۔ تاہم اردو کے ۷۰ فی صد الفاظ بقول مؤلف فرہنگ آصفیہ ہندی کے ہیں۔''

(بحوالہ ''چہارسو'' راولپنڈی، شمارہ جنوری فروری ۲۰۰۴ء صفحہ ۹۔)

مجھے حمد و نعت سے کوئی ذاتی کد نہیں ہے۔ بلکہ خدا اور رسول کی شان میں شاعر کے ادا کردہ جذبات اور محسوسات کا میں احترام کرتا ہوں۔ لیکن ادب کو مذہبی رنگ دینا مجھے سنجیدگی سے کھٹکتا رہا ہے۔ اُسے ہضم کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے اور سانس باہر کو چھوڑنا اُس سے بھی زیادہ مشکل۔ اگر اردو کے ہر رسالے کی ابتدا حمد اور نعت شائع کرنا ہی ٹھہری ہے تو کیوں نہ اگلے صفحات پر کوئی بھجن، گیت یا گرنتھ صاحب میں سے کوئی شبد پر وچن بھی شائع کیا جائے۔ اس لیے کہ اس زبان کو بنانے، سنوارنے اور بڑھانے میں ہندو، مسلمان اور سکھ ادیبوں، شاعروں، ناقدوں اور ماہرِ لسانیات کا برابر کا ہاتھ رہا ہے۔

مَیں چونکہ پچھلے چالیس برسوں سے کچھ زائد اردو زبان میں متواتر لکھتا چلا آ رہا ہوں۔ مجھے یقین سا ہو چلا ہے کہ میری نسل کے بعد اردو ادب میں کوئی ہندو، سکھ ادیب یا شاعر خال خال

ہی دِکھائی دے گا؟ ایسا کیوں ہوا ہے یہ کہنا مشکل ہے۔ البتہ اس کے پیچھے دیش کا بٹوارہ، تاریخی، مذہبی، قومی اور سیاسی عوامل ضرور کارفرما رہے ہیں اور ان دنوں بھی صورتِ حال کم و بیش وہی ہے۔ ہندوستان میں عام خیال یہ ہے کہ پاکستان کو بنانے میں اردو کا ہاتھ بڑھ چڑھ کر رہا ہے۔ رہی سہی کسر بابائے اردو مولوی عبدالحق نے پوری کردی، جب موصوف نے ۱۵رفروری ۱۹۶۱ء کو غالب برسی کے موقع پر کراچی میں کہا تھا:

> ''پاکستان کو نہ جناح نے بنایا اور نہ اقبال نے۔ بلکہ اردو نے پاکستان کو بنایا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف کی اصلی وجہ اردو زبان تھی۔ سارا دوقومی نظریہ اور سارے اختلاف صرف اردو کی وجہ سے تھے۔ اس لیے پاکستان پر اردو کا بڑا احسان ہے۔''

(بحوالہ ''قومی زبان'' کراچی۔ بابت ۱۶رفروری ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۱)

اس بیان نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور بھارت میں اکثریت کا رویہ مزید سخت ہوگیا۔ موجودہ غیر مسلم نسلیں اردو زبان کی حلاوت، مٹھاس، تہذیب، رکھ رکھاؤ اور مخلوطی عناصر کی تعریف ضرور کرتی ہیں۔ مگر فارسی اور عربی زبان کے بھاری بھرکم الفاظ اور مشکل تراکیب اُن پر گراں گزرتی ہیں۔ اُن کا نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ دقیق الفاظ اور وزنی تراکیب کا ہندوستانی دھرتی اور ہزاروں ورش پُرانی سنسکرتی کے ساتھ کیا سمبندھ ہے؟ کیا اردو والوں کا اپنی دھرتی اور اپنی مٹی کے ساتھ آزادی کے اُنسٹھ سال گزر جانے پر بھی کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ کیا وہ عمر بھر اپنے دیش کو صرفِ نظر کیے عربی اور عجمی تہذیبوں اور وہاں کی طرزِ زندگی کا سہارا لیتے رہیں گے؟ جبکہ ہماری اپنی زبان میں فارسی، عربی اور ترکی کے متبادل الفاظ موجود ہیں۔ کیا ان کا استعمال کرنا گناہ ہے؟ وہ الفاظ کوئی غیر تو نہیں، ہمارے اپنے ہیں۔ ان کی طرف دھیان دینا اس لیے بھی ضروری ہوگیا ہے کہ وہ ہمارا اجتماعی ورثہ ہے۔ اب جبکہ یہ سب ایک غیر مسلم شخص لکھ رہا ہے، وہی مطعون ٹھہرایا جائے گا۔ ممکن ہے کوئی فتویٰ بھی صادر ہو جائے۔

بھارت ایک آزاد، جمہوری اور سیکولر دیش ہے۔ یہاں ہر جاتی اور دھرم کو اپنے رسم و رواج،

روایات اور میراث کے ساتھ جینے کا پورا پورا ادھیکار ہے۔ مگر ہر قوم اور مذہب کو اپنے دیش کے اجتماعی ورثے کی طرف دیکھنا بھی لازم ہے۔ دنیاوی ادب میں صرف چار ہی عظیم (EPICS) نے جگہ پائی ہے۔ دو ایپکز ''رامائن اور مہا بھارت'' تو ہمارے ہیں۔ دیگر دو ''الیاڈ اور اوڈیسی'' یونان کے۔ بھارت کو اپنے ایپکز پر فخر ہے اور ہونا بھی چاہیے کہ ایسے بے مثال ایپکز کب کہاں لکھے جاتے ہیں۔ مگر اردو کے شعرا اور ادبا کا جانے کیوں اپنے عظیم ایپکز کے ساتھ کبھی گہرا تعلق نہیں رہا؟ اگر کسی تحریر میں ان کا ذکر آ بھی گیا تو وہ برائے نام یا محض حوالے کے طور پر ہی تھا۔ ایسا کیوں ہوا ہے؟ اور کیوں ہو رہا ہے؟ اس کا جواب اردو دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کے پاس یقیناً موجود ہوگا۔ عظیم شاعر فراقؔ نے بھی اس بات پر زور دیا تھا کہ اردو شاعری میں اپنے دیش کی مٹی کی بو باس، سنسکرتی، لوک ورثہ اور پرم پراؤں کو سمونا بہت ضروری ہے۔ لیکن.....؟؟

۱۹۶۵ء میں میری پہلی کہانی ''جعلی نوٹ'' شمع دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ تب سے مَیں ادب کی بدولت خود کو دریافت کرنے کے مشکل عمل سے گزر رہا ہوں اور یہ عمل تادمِ آخر جاری رہے گا۔ جن دنوں میں نے قلم سنبھالا تھا، تب گنتی کے ہی ادبی رسائل شائع ہوا کرتے تھے۔ کتاب، آہنگ، گفتگو، شاعر، تحریک اور آجکل۔ دیگر رسائل مثلاً تخلیق، تلاش، معیار، سوغات اور شاہراہ دم توڑ چکے تھے۔ ادبی فضا دھواں دھواں تھی۔ اردو زبان بھی روبہ زوال تھی۔ ترقی پسند تحریک عہدِ پارینہ کی داستان بن چکی تھی۔ لکھاری تحریک سے بیزار تھے۔ یوں بھی عالمی سطح پر زمانہ تیزی سے بدل رہا تھا۔ دنیا دو بلاکز میں بٹی ہوئی تھی۔ عوام میں ایک طرف بھوکے پیٹ کی جھلاہٹ تھی تو دوسری طرف بھرے ہوئے پیٹ کی اکتاہٹ تھی۔ کوریا جنگ کے بعد ویت نام جنگ اور اس کے بعد ہند و پاک جنگ۔ مثبت اقدار کا پامال ہونا۔ شہروں میں صنعتی پھیلاؤ۔ مشترکہ خاندانی نظام کا ٹوٹنا۔ بڑے شہروں میں روزگار کی تلاش میں آبادی کا آئے دن بڑھنا۔ فرد کا اکیلا ہو جانا۔ مادہ پرستی فروغ پا رہی تھی۔ بے گانگی، لایعنیت اور اجنبیت بڑھ رہی تھی۔ زندگی رنگ بدل کر بے معنی ہو رہی تھی۔ آدرش بھی دم توڑ رہے تھے۔ خدا کے تئیں عظمت، پاکیزگی اور

اہمیت کا جذبہ کھو رہا تھا۔ عام خیال یہ پنپ رہا تھا کہ خدا نام کی کوئی شے نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اُسے ہم نے پیدا کیا ہے۔ ایسے میں اچانک ایک ادبی رسالہ بنام ''شب خون'' منظر عام پر آیا۔ اُس کے کرتا دھرتا شمس الرحمان فاروقی تھے۔ وہ جدیدیت کا منشور بھی ساتھ لائے تھے، جو معاشرے میں فرد کی تنہائی، اُس کے اکیلے پن اور اس کی ذات کے کرب سے تعلق رکھتا تھا۔ منشور کے مطابق ہر شخص کی ذات میں ایک وشال جزیرہ، ایک مکمل دنیا آباد تھی، جو خود میں سیاست، سماجیات، معاشیات اور روحانیت کی روایات ساتھ لیے ہوئے تھی۔ ہر ادیب کو اپنا باطن کھنگال کر اُس کا تجزیہ کرنا مقصود تھا۔ وہ بنیادی طور پر آؤٹ سائیڈر تھا اور تاحیات رہے گا۔ ان دنوں فلسفۂ وجودیت کا بھی عالمی سطح پر اس قدر چرچا تھا کہ اردو کا ہر تنقیدی مضمون ژاں پال سارتر اور البیئر کامیو کے حوالوں اور ان کی خیال پرستی کے بغیر شائع نہیں ہوا کرتا تھا اور ناقدین خود پر نازاں تھے کہ وہ ایک عظیم فلسفے کی تشریح کر رہے تھے۔

مَیں نئی جہات، نئی راہیں، نیا منشور اور 'شب خون' جیسا جدید رسالہ پا کر نہال ہو گیا تھا۔ ایک طرح سے مجھے کھوئی ہوئی جنت مل گئی تھی۔ مَیں نے بھی دوسرے ادیبوں کی طرح علامتی، استعاراتی اور تجریدی کہانیاں سپردِ قلم کیں جو بین السطوری تھیں۔ تاکہ ان کی پرتیں، داخلی سچائیاں، نئے معنی اور گہرا علم قاری کی ذہانت میں اضافہ کرے۔ مجھ جیسا ادیب واقعی جدید بوتل میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن جب مَیں نے ۱۹۷۴ء میں لندن پہنچ کر مغربی تہذیب، اقدار، روایات، طبقاتی تفریق اور بھاگتی دوڑتی زندگی کو قریب سے دیکھا اور سفید فام لوگوں سے براہ راست ملا تو کھلا کہ جناب فاروقی نے بھارت کی جوان نسل کو جدیدیت کا جو نظریہ پیش کیا تھا وہ بیس پچیس سال پُرانا تھا۔ جبکہ مغربی ادبی شخصیات کا نقطۂ نظر بالکل ہی برعکس ہے۔ ان کے نزدیک زندگی آج بھی بے معنی ہے اور لوگ باگ مادہ پرست، بے حس اور صارفیت زدہ ہیں۔ لیکن وہ اُلجھی ہوئی بے معنی زندگی کو مزید اُلجھنے کی بجائے اُس میں مثبت اقدار، معنی، اپنائیت، ہمدردی، سچ اور صحت مند رویوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جب جب اردو ادب کی تاریخ رقم کی جائے گی تو مورخ بیتی صدی کی چھٹی دہائی سے آٹھویں دہائی کے جدید ادب کا احاطہ کرتے

وقت اس سیاہ دور کو گمراہ کن، بے معنی اور منفی قرار دے گا اور جدیدیت کے علمبردار فاروقی کو موردِ الزام ٹھہرائے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ مَیں نے جدیدیت کے ہیر پھیر میں اپنے کئی بہترین سال ضائع کیے۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ جدیدیت کے دم توڑتے ہی نامور ادبی ہستیوں نے چولے بدلنا شروع کر دیے۔ محترم نارنگ مابعد جدیدیت کا منظرنامہ لے کر میدان میں اُترے۔ جبکہ فاروقی نے چند طویل کہانیاں کلاسیکی، داستانوی اور بیانیہ پیرائے میں تحریر کیں جو پُر آشوب زمانوں کی بگڑتی مٹتی تہذیب اور مغلیہ عہد کے حالات کی ترجمان تھیں۔ فاروقی کو یقیناً اپنی فاش غلطی کا احساس ہو گیا تھا کہ ادب میں اپنے ماضی، اپنی روایات اور ثقافت سے آنکھیں چُرانا کتنا بڑا گناہ ہے۔ جبکہ جدیدیت کے دور میں یہ سب جائز تھا۔ اسی کارن جدیدیے بے جڑ کے پودے بن کر رہ گئے تھے۔

فن کار کی عمر عزیز کا جب نومبر ردسمبر شروع ہو جاتا ہے تو وہ غیر معمولی ادب تخلیق کرنے کو DESPRATE دِکھائی دیتا ہے۔ اُس کے ہاں قسم قسم کی تبدیلیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ بعض کے پیٹ میں سے شرعی داڑھی نکل آتی ہے، بعض اشتراکی ادیب موت کے خوف سے خدا کی شان میں قصیدے پڑھنے لگتے ہیں۔ بہت سے دہریے اللہ کی ذات پر ایمان لے آتے ہیں۔ فاروقی کا کلاسیکل ادب اور ہند اسلامی تہذیب کی طرف مراجعت کرنا بھی اس زنجیر کی کڑی تھی۔ درحقیقت آدمی اپنے آخری سفر سے پہلے اپنا نقش چھوڑنا کتنا ضروری سمجھتا ہے۔

''چکر'' میرا پانچواں کہانیوں کا مجموعہ ہے اور یقیناً آخری بھی۔ میری عمر کا بھی نومبر ردسمبر شروع ہو چکا ہے۔ بلکہ دسمبر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ جانے کب بلاوا آ جائے۔ موت سے نجات کس نے پائی ہے، جو مجھ کو عمر خضر نصیب ہوگی؟ اس مجموعے میں آٹھ کہانیاں شامل ہیں۔ چار طویل اور چار نیم طویل۔ مجھے لمبی کہانی لکھنے میں بڑا آنند پراپت ہوتا ہے۔ اُس کے کئی کارن ہیں۔ اول تو یہ کہ اس کا کینواس وسیع ہوتا ہے۔ دوئم کرداروں کے منفی، مثبت رویے جو انسانی جبلتوں پر مبنی ہوتے ہیں، آسانی سے پیش کیے جا سکتے ہیں، تاکہ وہ گوشت پوست کے ساتھ کہانی میں قاری کی نظروں کے سامنے چلتے پھرتے نظر آئیں۔ پھر کہانی میں اتنی آزادی، اتنی گنجائش

ہوتی ہے کہ جزئیات بھی تفصیل کے ساتھ پیش کی جاسکتی ہیں۔ بشرطیکہ وہ کہانی کے موضوع اور کرداروں کی حرکات اور ان کی ذہنی کیفیات سے جڑی ہوئی ہوں۔ سوئم کسی بھی واقعے کی حقیقت نگاری، عکاسی یا منظر کشی کرتے وقت خارجیت اور داخلیت کا امتزاج بھی اپنی جگہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یوں مصنف کے ذاتی رنگ، جذبات، فکر، تجربات اور مشاہدات واضح ہوتے ہیں۔ البتہ یہ بھی سچ ہے کہ ہر ادیب طویل کہانی لکھنے کا اہل نہیں ہوتا کہ اس کے ہاں ذہنی وسعت کی کمی پائی جاتی ہے۔ ذہنی وسعت ادیب کے ہاں تب پیدا ہوتی ہے جب وہ ہر طرح کے تعصب، نفرت، حسد اور مذہبی بالادستی سے آزاد ہو۔ علاوہ ازیں وہ وسیع المطالعہ بھی ہو۔ انسانی سطح پر سانس بھرتے ہوئے شدت سے محسوس کرے کہ منش تو مٹی، اگنی، پون، جل اور گگن کا بنا ہوا پتلا ہے۔ کسی روز بھی مٹی میں مل کر خاک ہو جائے گا۔ پھر وہ انسانی فطرت کا بھی شعور رکھتا ہو۔ تب کہیں دنیاوی حقائق اور روحانی باتیں اس کی سوچ میں وسعت پیدا کرنا شروع کرتی ہیں۔ ان تمام نکات کا احساس آپ کو میری کہانیاں پڑھتے وقت یقیناً ہوگا۔ خاص طور پر 'فاصلہ' 'چکر' 'تعلق' اور 'چتری والا کیلا'۔ دیگر چار کہانیاں نیم طوالت کی حامل ہیں۔ ہر کہانی موضوعی اعتبار سے فنی تقاضے ساتھ لیے ہوئے ہے۔ اس کا برتاؤ، ہیئت اور کرافٹ بھی جدا ہے۔ تمام کہانیاں سماجی حقیقت نگاری سے اول تا آخر وابستہ ہیں۔ سوائے 'یوٹرن' کے۔ وہ ایک جیتی جاگتی فنتاسی ہے۔ لیکن اُسے سپردِ قلم کرتے وقت بھی مَیں نے حقیقت نگاری کا دامن نہیں چھوڑا کہ یہ میرے تخلیقی عمل اور میری شخصیت کا جاندار حصہ ہے۔

مَیں ادب میں سگِ شہرت اور سگِ دنیا سا آدمی کبھی نہیں رہا۔ میرے تعلقاتِ عامہ بھی نہ ہونے کے برابر رہے۔ لیکن جب کبھی مَیں اپنے ہمعصروں کو دیکھتا ہوں تو بیشتر اس ڈھب کے ہیں جو معیاری ادب تخلیق کرنے کے بجائے انعام واکرام پانے کے چکر میں اوچھے، ذلیل اور غیر اخلاقی حربے استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ مجھے بڑا اچنبھا ہوتا ہے اور مَیں سوچتا ہوں کہ یہ کیسی مخلوق ہے؟ کیسے کردار ہیں جو ادب میں چلے آئے ہیں؟ یہ لوگ تو ضمیر کے ہجے سے بھی واقف نہیں ہیں۔ کیا یہ سب بدلتے ہوئے زمانے کا قصور ہے یا سستی ذہنیت کے ادیب و شاعر

کامیابی اور شہرت پانے کی خاطر یہ طریقہ کار استعمال کر رہے ہیں؟
ملائکہ، میرے آواز سن رہے ہونا؟
تمھیں کیا بتاؤں کہ ان دنوں اردو ادب میں کیا کیا گل کھلائے جا رہے ہیں۔ انتظار حسین نے تو یہاں تک کہا ہے:

''یا شیخ عالم کی پہچان کیا ہے؟ فرمایا اُس میں طمع نہ ہو۔ عرض کیا: طمع دنیا کب پیدا ہوتی ہے؟ فرمایا جب علم گھٹ جائے۔ عرض کیا: علم کب گھٹتا ہے؟ فرمایا جب درویش سوال کرے۔ دیوانہ ہوش مند ہو جائے۔ دانش مند منافع کمائے۔''

(زرد کتا سے اقتباس)

تمھیں تو پورا پورا علم ہے کہ میرا جیون کن کن ادوار سے گزرا ہے۔ مَیں جب تک ممبئی جیسے مہانگر میں تھا۔ مجھے اپنا شریر اور آتما کو اکٹھا رکھنے کی خاطر بلا ناغہ فلمی کنواں کھودنا پڑا۔ کئی مرتبہ زمین سنگلاخ تھی، پانی برآمد نہ ہوا۔ میری بھوک اور نا آسودگی برابر بڑھتی رہی۔ مگر جلد ہی تم نے مجھے ایک نادر موقع فراہم کیا اور مَیں مستقل طور پر نانِ جویں اور بہتر زندگی کی تلاش میں بیرون ملک چلا آیا۔ بد قسمتی سے وہ ملک ہمارے سابق آقاؤں کا تھا۔ فرنگیوں کی سرزمین پر میرے معاشی مسائل ضرور حل ہو گئے تھے اور مَیں اتنا خوش تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ لیکن میرے باطن میں ادبی الاؤ بھی روشن تھا، جو تیز گام زندگی کے دوران تیزی سے بجھا جا رہا تھا اور مَیں اپنی جگہ پریشان تھا۔ ان دنوں کل برطانیہ میں آٹھ دس ہی معتبر ادیب و شاعر قیام پذیر تھے۔ مَیں ان سے مل ملا کر اور کچھ لکھ لکھا کر اپنی پیاس بجھالیا کرتا تھا۔ مگر اچانک عیار زمانے نے کروٹ لی اور دیکھتے ہی دیکھتے انگلستان میں سینکڑوں خودرو گگر متوں (MUSHROOMS) کی مانند شاعر اور ادیب ادبی میدان میں اُگتے نظر آئے۔ شہر در شہر ادبی انجمنیں وجود میں آئیں۔ چند رسائل بھی منظر عام پر آئے۔ اُن کے جعلی ڈگری یافتہ مدیر خود کو ڈاکٹر بھی لکھنے لگے۔ انجام کار تان ''اُردو مرکز'' کے بننے پر ٹوٹی، جو عالمی بینک بی سی سی آئی کی بدولت وجود میں آیا تھا اور جس کے روح رواں مقبول شاعر افتخار عارف تھے۔ پھر جلد ہی عالمی سطح پر اعلان ہوا کہ برطانیہ اُردو زبان کا ہندوپاک کے بعد تیسرا مرکز بن چکا

ہے۔ اُس کا ردِ عمل بڑا سخت، سنجیدہ اور نقصان دہ تھا۔ برصغیر سے معروف، نیم معروف، انجان اور چند تیسرے درجے کے ناقدین کے ساتھ شعرا، ادیب اور مدیران بھی لندن میں وارد ہونے لگے۔ محفلیں گرم ہوئیں۔ دعوتیں اُڑیں۔ مشاعروں میں مقامی شعرا کے بے وزن، بے بحر شعر سن کر ہال کی چھتیں اُڑیں۔ کرسیاں ٹوٹیں۔ پھر کانفرنسوں کے ساتھ سمینار، رسائل و جرائد اور نئے ادارے اُردو کا سازگار ماحول تیار کرنے لگے۔ لیکن مجھے تم سے یہ شکایت ہے کہ بیرونی شاعر، ادیب اور ناقدین تو اپنا اُلو سیدھا کر کے چلے جاتے ہیں۔ لیکن میرا واسطہ لُگر متوں سے ہی رہتا ہے۔ یہ لُگر متے، یہ کھمبیں نہ تو موجودہ ادب سے واقف ہیں، نہ زبان سے، نہ ادبی ورثے سے اور نہ ہی ادبی ارتقا سے۔ اُن سے گفتگو کے دوران اگر مَیں معروف غزل گو حفیظ ہوشیار پوری کا ذکر کر بیٹھوں تو مشکوک نظروں سے میری کم علمی پر مسکرا کر احساس دلاتے ہیں کہ مَیں نے حفیظ جالندھری کا نام لینے کی بجائے ایک غلط شاعر کا نام لے ڈالا ہے۔ وہ حفیظ ہوشیار پوری جیسے بلند پایا شاعروں کے نام اور کام سے واقف ہی نہیں ہیں۔ بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ ایک بار مَیں نے سدا بہار ناولسٹ اور افسانہ نگار بلونت سنگھ کا ذکر لُگر متوں سے کیا کہ اُس شخص نے ''رات، چور اور چاند'' جیسا با کمال ناول لکھا تھا تو انھوں نے مجھ سے دریافت کر کے اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہا کہ کیا بلونت سنگھ پنجابی زبان کا مصنف تھا؟

اُردو کے تیسرے مرکز کا یہ عالم ہے کہ لندن میں جب کوئی کانفرنس، سمینار یا مشاعرہ منعقد ہو تو وہی سامعین دِکھنے میں آتے ہیں جو گذشتہ پچیس تیس برسوں سے ہر تقریب میں حاضر ہوتے ہیں۔ لیکن اب وہ ضعیف ہو چکے ہیں۔ وہ زبان کا چٹخارہ اور اس کی لذت اُٹھانے کو ہر پروگرام میں چلے آتے ہیں۔ اب اُن میں سے کافی لوگ گزر بھی گئے ہیں۔ باقی جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ پچھلے تیس برسوں کی تقریبات میں مجھے سامعین میں کبھی جوان لڑکے یا لڑکی دِکھائی نہیں دیے۔ جو شعر، افسانہ، مضمون اور تقریر سننے میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ لیکن اس کے باوجود برطانیہ اُردو کا تیسرا مرکز بن چکا ہے۔

ملائکہ! مَیں نے بیتے چار دہوں میں اچھی بُری، معیاری اور ناقابل فراموش کہانیاں لکھی ہیں۔

ناول بھی لکھے۔ ''وشواس گھات'' جو مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے مزاج، اُن کی آمیزش اور آویزش پر مبنی ہے، کی پذیرائی ہندو پاک میں بلند پیمانے پر ہوئی۔ اگر کوئی مضمون نگار یا نقاد ''وشواس گھات'' جیسے فکر انگیز ناول کا ذکر اپنے مضمون میں نہ کرے تو وہ قارئین کے ساتھ اپنی نظر میں بھی متعصب اور جانب دار ٹھہرے گا۔ یہ لکھنے کی ضرورت یوں آن پڑی ہے کہ آج ادب میں سازشیں زوروں پر ہیں۔ گروپ بندیاں الگ سے قائم ہیں۔ ایک گروپ کا نقاد کسی دوسرے گروپ کے ادیب یا شاعر کی کتاب پر اول تو تبصرہ کرنے کو تیار نہیں، لیکن کسی دباؤ کے تحت اُسے تبصرہ کرنا بھی پڑ جائے تو وہ کتاب کے متعلق اپنے تأثرات ایسی گول مول تنقیدی زبان میں پیش کرتا ہے کہ فن کار کے ادبی مقام اور ساکھ میں کوئی اضافہ نہ ہو۔ لیکن وہی نقاد جب اپنے گروپ کے کسی فن کار کی تخلیق پر تبصرہ کرتا ہے تو زمین آسمان کے قلابے ملا کر اُسے ہمالیہ کی چوٹی پر بٹھا دیتا ہے۔ رہا میرا سوال تو مَیں ابتدا سے ہی کسی گروپ کے ساتھ وابستہ نہیں رہا اور نہ ہی میرے کسی نقاد کے ساتھ مراسم رہے ہیں۔ تم میرے مزاج سے تو واقف ہی ہو کہ مَیں تخلیقی کاموں کو ترجیح دیتا ہوں کہ معیاری ادب پیدا کرنا ہی میرے جیون کا مقصد رہا ہے۔ چلتے چلتے ایک بات تم سے اور بھی کہنی ہے اور وہ اپنی جگہ نہایت اہم ہے۔ جب سے ہند سرکار نے اُردو زبان کے فروغ کی خاطر دیش کے ہر صوبے میں اُردو اکادمی رائج کی ہے اور وافر فنڈز بھی دیے ہیں، تب سے بندر بانٹ متواتر جاری ہے۔ اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کو مالی فائدہ پہنچا ہے۔ وہ انعامات کی رقم پا کر، پھر سمیناروں اور مشاعروں میں شرکت کر کے اپنی جیبیں موٹی کر لیتے ہیں۔ نیز وہ اپنا مجموعہ شائع کراتے وقت اکادمیوں سے جزوی مالی تعاون بھی طلب کرتے ہیں، جو اُن کو بہ آسانی دستیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسری طرف بادلوں میں چھپی ہوئی منظم سازش بھی جاری ہے۔ اس سازش نے بی جے پی کی شکست کے بعد خاص طور پر زور پکڑا ہے۔ روز بروز اس کی شدت بڑھ رہی ہے کہ کن خطوط پر اُردو زبان کو مکمل اسلامی رنگ دے کر اُسے مسلمانوں کی زبان بنا دیا جائے۔ اس سلسلے میں اکادمیوں کے سربراہ، کالجوں کے پروفیسر، اخبارات اور رسائل کے مدیران اپنا اپنا رول شعوری یا غیر شعوری طور پر ادا کر رہے ہیں۔ تاکہ اُردو زبان کو مسلمانوں کے ساتھ جوڑ کر اُن کی

تہذیبی شناخت قائم کی جائے۔ اس طرح انھیں اُردو کو ہندی سے یکسر الگ زبان تسلیم کرانے کا جواز مل جائے گا۔ لیکن یہ کھیل بڑا خطرناک ہے۔ دیش کا عوامی توازن بھی بگڑ سکتا ہے اور دعوتِ فکر بھی دیتا ہے۔ مانا کہ ہر مذہب اور ہر قوم میں اچھے بُرے لوگ پائے جاتے ہیں۔ لیکن تکلیف وہاں ہوتی ہے، جب لوگ باگ آپ کو مخصوص مذہبی عینک سے دیکھنا شروع کر دیں۔ اُن کے ہاں وسیع النظری اور صحیح تناظر میں دیکھنا محال ہوتا ہے۔

ملائکہ! مَیں اس نوٹ کے ساتھ اپنا مقدمہ ختم کرنا چاہتا ہوں کہ اُردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں۔ وہ الگ الگ رسم الخط میں ضرور لکھی پڑھی جاتی ہیں۔ مگر دونوں کے شواہد، قواعد اور صرف ونحو یکساں ہیں۔ اُردو میں فارسی اور عربی زبانوں کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جبکہ ہندی کے شبد بھنڈار میں علاقائی زبانوں اور مقامی بولیوں کے بول ملتے ہیں جو ہماری سنسکرتی کے ساتھ پراچین کال سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہمیں اپنے دیش کی زبانوں اور قوموں کی سلامتی کی خاطر اپنے اختلافات کو مٹا کر ایک دوسرے کو قبول کرنا ہوگا کہ زبانیں تو دیش کا سرمایہ ہوتی ہیں۔

جتیندر بلّو

لندن

بیس اکتوبر، دو ہزار چھ۔

☆☆

چکّر

مستی الگ سے چھائی ہوئی تھی اور خوشی کا عالم یہ تھا کہ نیند کے ساتھ میرا رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ بار بار میری بند آنکھیں کھل کر اصرار کرتیں کہ بستر سے اُٹھ کر مَیں اس ای میل (E-Mail) کو پھر سے پڑھوں جو شام کو دہلی سے آیا تھا اور جسے مَیں کئی بار پہلے بھی پڑھ چکا تھا۔ لیکن دل تھا کہ کسی بھی طور چین لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ بالآخر بستر سے چھلانگ لگا کر میں نے ای میل کا مضمون پھر سے پڑھا۔ عبارت مجھے قریب قریب یاد ہو چکی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا جملہ خود بخود ذہن میں ابھرتا چلا آیا اور میرے موٹے موٹے ہونٹ لگا تار مسکراتے رہے۔

اٹھارہ نومبر، دو ہزار دو۔

ڈیر بمل،

میں لندن آ رہی ہوں۔ دسمبر کی اکیس تاریخ کو وہاں پہنچ جاؤں گی۔ ویزے کے واسطے پاسپورٹ داخل کروا دیا ہے۔ لیکن اس بار عقلمندی یہ بھی کی ہے کہ ملٹی پل ویزے (Multiple Visa) کی

خاطر رقم بھر دی ہے۔ تمھیں تو معلوم ہے کہ میرے پانو میں پیدائشی چکر ہے۔ وہ ایک مقام پر ٹک کر نہیں رہ پاتے۔ انڈیا سے چار پانچ ماہ باہر ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔ فون پر اطلاع کر دوں گی کہ میں کس ائیر لائنز اور کس فلائٹ سے آ رہی ہوں۔ لیکن اس بار ایرپورٹ پر تم وقت سے پہنچ جانا۔ پچھلی مرتبہ کی طرح انتظار مت کروانا۔ یہ کرسمس اور نیا سال مَیں لندن میں منانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ نئے سال کی شام میں ٹرافلگار اسکوائر کا وہ نظارہ میں بھلائے نہیں بھولتی جب بگ بین (Big Ben) کا گھڑیال رات میں بارہ بجنے پر گھنٹے بجانا شروع کرتا ہے تو ہزاروں کی تعداد میں وہاں کھڑے لوگ اپنی شناخت، قوم، رنگ، نسل اور مذہب کو فراموش کر کے ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں، چومتے ہیں اور صدق دل سے نئے سال کی مبارکباد دیتے ہیں۔ اس سمے مجھے ہر رنگ اور ہر مذہب کے لوگ ایک سے لگتے ہیں۔ پھر عوام کا رقص، شور شرابہ، جلتی بجھتی پھلجڑیاں ،آتش بازیاں، رنگ برنگی روشنیاں الگ سے اپنا جلوہ پیش کرتی ہیں اور آسمان پر چراغاں ہو جاتا ہے۔ اُن لمحات کو مَیں ہمیشہ کے لیے اپنے اندر سمو لینا چاہتی ہوں کہ وہ میری کتاب کا ایک اہم حصہ ہوگا۔

مضمون لمبا ہو گیا ہے۔ ایرپورٹ پر وقت سے پہنچ جانا۔ پلیز، انتظار مت کروانا۔

تارا

۲

کئی سالوں کے وقفے کے بعد مَیں اپنے وطنِ عزیز گیا تھا۔ بھارت کے معاشرتی طبقوں میں اور عوام میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ نچلی سطح کے طبقے اور غریب غربا مزید غریب ہو چکے تھے۔ جب کہ متوسط اور اونچے درجے کے طبقوں میں خوشحالی آئے روز بڑھ رہی تھی۔ میرے رشتے دار اور دوست احباب بھی اپنے رویوں کے ساتھ بدلے بدلے سے تھے۔ وہ مجھ سے زیادہ مغرب زدہ ہو چکے تھے۔ صرف لباس کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ ان کے دیکھنے، سوچنے

اور محسوس کرنے کا ڈھنگ بھی بدلا بدلا سا تھا۔ لیکن بعض دوست ایسے بھی تھے جو اپنی دیرینہ اخلاقی، تہذیبی اور سماجی روایات سے جڑے ہوئے تھے۔ ان میں میرا ایک دوست انور بلگرامی بھی تھا۔ اس نے میرے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کرنا چاہا تھا۔ لیکن میں نے شرکت کرنے سے معذرت چاہی تھی کہ مَیں اپنی کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کہانی ساتھ لے کر نہیں آیا۔ لیکن میرا جگری دوست کہاں ماننے والا تھا۔ اس نے اپنے بُک شیلف میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے ایک کتاب نکالی جو دھول سے اَٹی پڑی تھی۔ پھر اُسے جھاڑ پونچھ کر میرے سُپرد کر دیا۔ وہ میرا پہلا افسانوی مجموعہ ''پہچان کی نوک پر'' تھا۔ اب میرے واسطے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ لہٰذا مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق، میں مقررہ دن کے مقررہ مقام پر کتاب بغل میں دبائے وہاں پہنچ گیا۔ لیکن تقریب میں جانے سے پہلے میں نے اپنے ہوٹل کے کمرے میں دو تین جام اس غرض سے چڑھائے کہ خود اعتمادی پا کر کہانی پڑھتے وقت گھبراہٹ سے دور رہوں۔

سامعین میں میرے آشناؤں اور دوستوں کے درمیان تارا بھی موجود تھی۔ اسے دیکھنے اور اس سے ملنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ڈھیلا ڈھالا سا گھٹنوں کو چھوتا ہوا بسنتی کرتا۔ ویسی ہی کھلی کھلی سی جینز اور پیروں میں عام سی چپل۔ بال بکھرے ہوئے، سگریٹ کے کش پہ کش لیے جا رہی تھی۔ وہ بلگرامی کے قریبی دوستوں میں سے تھی۔ پتہ چلا کہ وہ فرانسیسی زبان کے ساتھ وہاں کے ادب اور کلچر سے بھی واقف ہے۔ ہندی زبان میں بھی رواں ہے اور اردو سے تو اُسے دیوانگی کی حد تک عشق سا ہے۔ بلگرامی کے تعارف کرانے پر میں نے صدرِ محفل سے اجازت چاہی اور اپنی کہانی ''مسیحا'' پڑھنا شروع کی۔ اُس کا مرکزی کردار ایک سنکی مصور تھا۔ وہ ملک ملک، شہر در شہر اس غرض سے بھٹکتا پھرتا تھا کہ اُسے ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جس کی صورت میں اُسے دنیا کے ہر شخص کی شکل دکھائی دے۔ وہ اس کا پورٹریٹ بنانا چاہتا تھا۔ جس میں وہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ آدمی بنیادی طور پر خود غرض ہے، کمینہ ہے، لالچی ہے، مطلبی ہے، سازشی ہے اور مادہ پرست بھی ہے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ انانیت کا مارا اور اقتدار کا بھوکا بھی ہے اور موقع ملنے پر ذاتی مفادات کی خاطر فاشسٹ بننے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک دیوانے کا جان لیوا خواب تھا جس کا پورا

ہونا ناممکن سا تھا۔ لیکن مصور پکی دھن کا مالک تھا اور اپنی جستجو میں سرگرم عمل تھا۔ سامعین ہمہ تن گوش تھے۔ تارا بھی ہر جملہ غور سے سن رہی تھی۔ میں جب کہانی کے اس موڑ پر پہنچا، جہاں مصور کا ایک ادیب دوست اُسے سرِ راہ اچانک مل جاتا ہے۔ وہ مصور کو انتہائی لاغر ٹوٹا پھوٹا پا کر اور اس کے پریشان بال اور بڑھی ہوئی داڑھی کو دیکھ کر افسردہ ہو جاتا ہے۔ لیکن بیک وقت اُسے مصور سے ہمدردی بھی ہو جاتی ہے۔ مٹھیاں بھینچ کر اپنی خفگی کا اظہار کرتا ہے:

''کب تک بھٹکتے رہو گے؟''

''جب تک سنبھلوں گا نہیں۔''

''کب سنبھلو گے؟''

''جب بھٹکنا چھوڑ دوں گا۔''

''تو پھر تم بھٹکنا چھوڑ کیوں نہیں دیتے......ایک جگہ ٹک کر کام کیوں نہیں کرتے؟''

''تم واقعی تھرڈ ریٹ افسانہ نگار ہو۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ حرکت زندگی ہے اور جمود موت۔''

میں نے اگلی سطر پڑھنے کو ابھی لبوں کو جنبش دی ہی تھی کہ سامعین میں سے ایک نسوانی آواز تالی کے شور میں ابھری: ''واہ.....واہ۔'' میں نے گردن اُٹھا کر دیکھا تو وہ تارا تھی۔ تالی بجاتے ہوئے کہے جا رہی تھی: ''واہ۔ واہ۔ ہر ڈائیلاگ کہانی کی پرتیں کھولتا چلا جا رہا ہے۔ دونوں کردار خود کو واضح کر رہے ہیں۔ ایک کو تلاش ہے دوسرا اُسے روکنا چاہتا ہے۔''

کہانی کے اختتام پر مصور تلاش بسیار کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن اس کی خاطر اُسے اتنی بڑی قیمت چکانی پڑتی ہے کہ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ لیکن اسے ذرا بھی افسوس نہیں ہوتا کہ وہ اپنے انجام سے پہلے ہی واقف تھا۔ کہانی ختم ہوئی تو اُسے مجموعی طور پر سب نے پسند کیا تھا۔ بعض معروف ادبی شخصیات نے اپنی دانست کے مطابق اپنے تأثرات بھی بیان کیے تھے۔ چائے کے دوران تارا نے مجھ سے جاننا چاہا کہ اگر اس کہانی کا ہندی ترجمہ ہو چکا ہے تو اس کی ایک کاپی اُسے عنایت کی جائے۔ اس لیے کہ وہ اردو اسکرپٹ پڑھ نہیں پاتی۔ لیکن زبان ضرور سمجھ لیتی ہے۔ وہ اس کہانی کو فرانسیسی زبان میں منتقل کرنا چاہے گی۔

''تمھارا بے حد شکریہ۔ کاپی تمھیں ہر حالت میں ملے گی.... یہ کہانی بھارت کی ہر زبان میں موجود ہے۔ ترجمے کا کام ساہتیہ اکادمی کی نگرانی میں ہوا تھا۔''

میرا دہلی میں جب تک قیام رہا، تارا سے سرسری اور تفصیلی ملاقاتیں جاری رہیں۔ ایک دوپہر کو ہم کناٹ پیلیس کے نرولا ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ موسم گرم تھا۔ سورج تپ رہا تھا۔ ہوا بھی تھمی ہوئی تھی۔ میں یخ بیئر سے دل بہلا رہا تھا۔ جبکہ وہ گہری کالی کافی پی رہی تھی اور ساتھ میں پنیر پکوڑوں کی لذت اُٹھا رہی تھی۔ پچھلی ملاقات کے دوران جب میں نے اُسے ''مسیحا'' کا ہندی ترجمہ پیش کیا تھا تو اس نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اسے نہایت سنجیدگی سے پڑھے گی۔ کیوں کہ کوئی بھی رچنا ہو، اُسے سننے میں اور خود پڑھنے میں زمین آسمان کا فرق رہتا ہے۔ میرا ذاتی خیال بھی یہی تھا کہ کہانی مجمع میں نہ سنانے کی چیز ہے اور نہ ہی سننے کی۔ بلکہ اسے ذاتی طور پر پڑھ کر ہی اس کا ہر پہلو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ پلیٹ سے ایک پکوڑا اُٹھا کر بولی:

''کوئی بھی لیکھک اس سچ سے آنکھ نہیں چرا سکتا کہ اس کی رچنا میں اس کی سوچ کے اپنے رنگ بکھرے ہوتے ہیں۔ تمھاری کہانی کا مصور اول نمبر کا قنوطی تھا۔ منفی سوچ رکھتا تھا۔ کیا تم بھی جیون کو اسی نظر سے دیکھتے ہو؟''

''نہیں تارا نہیں،'' میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا:

''آدمی خیر و شر کا پتلا ہے۔ مصور کی زندگی میں حالات کچھ ایسے رونما ہوئے تھے کہ وہ یکسر قنوطی بن گیا تھا۔ اس کے رویوں میں انسانی فطرت کے تمام منفی رنگ در آئے تھے۔''

وہ بامعنی مسکراہٹ کے ساتھ میری آنکھوں سے ہوتی ہوئی میرے اندرون کا جائزہ لینے لگی۔ میں نے اپنا زاویۂ نگاہ پیش کرنا ضروری جانا:

''دیکھا جائے تو یہ سنسار بڑا سندر ہے۔ جیون انمول شے ہے۔ یگوں کے بعد منش جنم پاتا ہے۔ اُسے اپنے علاوہ انسانیت کی بھی قدر کرنی چاہیے۔''

''بلکہ اسے بدلتی ہوئی اقدار اور حالات کے ساتھ خود کو بھی بدلنا چاہیے۔''

''ہاں، یہ ضروری ہے۔ ورنہ زندگی ایک ہی مقام پر ٹھہر جائے گی۔''

''بالکل''

میں نے ہر ملاقات میں اسے ملنسار، بلند ذوق اور دنیاوی معاملات میں باخبر پایا تھا۔ ہمارے درمیان دوستی کا پُل مضبوط ہوتا جارہا تھا۔ تارا نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ اس دیش کے نامور ہارٹ سرجن ڈاکٹر بسواس کی بیوی ہے۔ اس نے یورپ میں اعلیٰ تعلیم پاکر کئی طبی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ وہ راجدھانی میں ایک عظیم الشان ہسپتال، جس کی لاگت اربوں کھربوں روپے کی ہوگی وہ اسے ''تارا ہاسپٹل'' کے نام سے قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ دن رات اپنے پروجیکٹ میں مصروف اس کی تکمیل کے خواب دیکھا کرتا ہے۔ لیکن جب کبھی وہ بیرون ملک کانفرنسوں اور سمیناروں میں شرکت کرتا ہے تو اُسے بھی ساتھ لے کر جاتا ہے۔ مغربی دنیا اس کے نزدیک بلا کی کشش رکھتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے بچپن سے جوان ہونے تک اپنے والدین کے ساتھ کئی ملک دیکھ چکی ہے۔ یہیں سے اس کے یہاں سیر و سیاحت کا بھرپور شوق پیدا ہوا تھا۔ اس کے پانو میں چکر اس کی یوم پیدائش جنم کنڈلی اور اس کے ستارے کے تحت اتنا مضبوط ہے کہ ہر تیسرے چوتھے مہینے اس کے ہاں کوئی نیا ملک، کوئی نیا شہر دیکھنے کی خواہش جاگ اٹھتی ہے اور وہ بے بس ہوکر رہ جاتی ہے۔

''اچھا۔ اگر ایسا ہے تو باہر کی دنیا کا تمھیں خاصا تجربہ ہوگا..... کبھی لندن آنا ہو تو ضرور ملنا۔''

''میں لندن دیکھ چکی ہوں۔ وہ شہر مجھے اچھا لگتا ہے.... اگر وہاں کبھی آئی تو ملاقات رہے گی۔''

مَیں نے اپنا کارڈ نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔

۳

حال ہی میں میری طلاق ہوئی تھی۔ پانچ سال، سات ماہ اور دس روزہ شادی شدہ زندگی کے ختم ہونے پر مَیں خوش نہ تھا۔ لیکن اس حد تک مطمئن ضرور تھا کہ جو خواہش گذشتہ کئی ماہ سے مجھے تڑپا رہی تھی، اُسے عملی شکل دینے کا موقع مل گیا ہے۔ لیکن چند روز بھی نہ بیتے تھے کہ اکیلا

پن مجھ پر سوار ہونے لگا۔ خاص طور پر شام کے وقت کام سے فارغ ہو کر جب میں گھر میں قدم رکھتا تو کمروں میں پھیلا ہوا سناٹا، کچن میں گہری خاموشی اور ویران دیواریں پریشان کرنے لگتیں۔ لیکن یہ احساس مجھے ضرور حوصلہ دیتا کہ زندگی کا اصلی سفر تو اب شروع ہوا ہے، جسے تن تنہا یا نئی شریک حیات کے ساتھ طے کرنا ہوگا۔ کوئی زمانہ تھا کہ میں جولیا کی محبت میں سر سے پا تک گرفتار تھا۔ کوئی لمحہ ایسا نہ گزرتا جب میں اس کی دلکش شخصیت کے متعلق نہ سوچتا۔ یہی حال کم وبیش جولیا کا بھی تھا۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ وہ عشق ہم دونوں کی زندگی کا پہلا عشق تھا اور ہم اتنے خوش تھے کہ خود کو ALPS پہاڑ کی برفانی چوٹیوں پر کھڑا پا رہے تھے۔ معاشی اعتبار سے ہم دونوں برسر روزگار تھے اور نامور کمپنیوں میں پیشہ ورانہ ملازمت کرتے تھے۔ وہ ایک انشورنس کمپنی سے منسلک تھی، جب کہ میں ایک روزنامہ اخبار سے۔ وہ مجھ سے زیادہ پڑھی لکھی خاتون تھی اور اونچے عہدے پر فائز تھی۔ لیکن اس نے مجھے ازدواجی زندگی کے دوران کبھی یہ احساس نہیں دلایا کہ میں اس سے کم تعلیم یافتہ ہوں اور اس کا کہا یا فیصلہ گھریلو معاملات میں زیادہ وزن رکھتا ہے۔ وہ انفرادی آزادی اور انسانی حقوق کی قائل تھی۔ جمہوری قدروں کی طرفدار اور پاسدار بھی۔ لیکن جب ہمارے درمیان پانچ برس گزر گئے تو مجھے ازدواجی زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوا اور وہ تھا ایک خوبصورت سا گل گوتھنا بچے کا۔ ایک ویک اینڈ کی پہلی شام میں میں نے جولیا کے گوش گزار کیا کہ پانچ برس تو ہم لوگوں نے ہنستے کھیلتے، قہقہے لگاتے اور مزے لوٹنے میں گزار دیئے ہیں۔ اب ہمیں فوراً اپنی فیملی کو بڑھا لینا چاہیے۔ میں خود کو اور تم کو اس بچے میں دیکھنے کو مرا جا رہا ہوں۔ وہ میرا اندرون جان کر از حد سنجیدہ ہو گئی تھی۔ بولی:

''ہمی، دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے۔ مگر چند مجبوریاں ہیں۔ ہم دونوں کام کاج والے ہیں۔ بچہ کون سنبھالے گا؟ اس کی پرورش کون کرے گا؟ بے بی سٹنگ اور نرسری میں اس کی دیکھ بھال کے لیے اونچے دام ادا کرنے پڑتے ہیں.... خیر ہم دونوں کی آمدنی تو اچھی ہے اور ہم برداشت بھی کر سکتے ہیں۔''

''تو پھر پرابلم کیا ہے؟''

''مجھے ڈپٹی ڈائرکٹر کی جاب پر موشن کچھ دنوں میں ملنے والی ہے۔ فیصلہ ہو چکا ہے.....دوسری بات جتنے بھی کمپنی ڈائرکٹرز ہیں وہ سب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ کوئی بھی جلد لڑھک سکتا ہے۔ پھر میں خود بخود ڈائرکٹر بن جاؤں گی۔''

گلاس ہمارے آگے رکھے ہوئے تھے۔ مجھے اس کا سہارا لینا پڑا کہ مجھے اپنا دل اُگلنا تھا۔

''تمھاری سوچ اپنی جگہ اور انتظار اپنی جگہ.....مگر مَیں ایک بات کھلے لفظوں میں کہہ دوں کہ مَیں اولاد کے بغیر نہیں مرنا چاہتا.....مَیں اس میں اپنا خون، اپنا وجود اور اپنی ذات دیکھنا چاہتا ہوں۔''

اس نے بھی ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھالیا:

''کیا یہ تمھارا آخری فیصلہ ہے؟''

''تم کہہ سکتی ہو کہ ہاں۔''

''تو پھر تم کو بھی میرا فیصلہ جاننا ہوگا؟''

''مَیں سُن رہا ہوں۔''

''مَیں ڈائرکٹر بننے پر ہی ماں بننا پسند کروں گی۔''

''ممکن ہے تب تک ہماری عمر اور بھی ڈھل جائے۔ پانچ، سات، دس برس؟ ممکن ہے اور زیادہ؟''

وہ سر کھجانے لگی۔ پھر انتہائی پیار سے مجھے دیکھ کر کہا:

''مَیں تمھارے جذبات کی قدر کرتی ہوں۔ مَیں تمھاری سوچ پر کوئی پہرا بٹھانا نہیں چاہتی۔''

یہ کہہ کر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

اس رات مَیں نے جولیا کو ٹوٹ کر پیار کیا تھا اور اُسے منانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ وہ سدا کی طرح مسکراتی رہی اور اپنے مخصوص انداز میں پیار کا جواب پیار سے دیتی رہی۔ میرے کان میں سرگوشی کی:

''تم اولاد کے لیے اتنے DESPRATE کیوں ہو؟''

جانے کیوں پُرکھوں کا کہا اور منو کی لکھی ہوئی کتاب ''دھرم شاستر'' کا حصہ یاد آ گیا اور مَیں بلا سوچے سمجھے بول اُٹھا:

''ہماری مقدس کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر مرد کنوارا مر جائے یا شادی کے بعد اس کے اولاد نہ ہوتو وہ اگلا جنم آدمی کی جون میں نہیں، کسی جانور کی شکل میں لیتا ہے۔''

یہ سننا تھا کہ جولیا نے اتنے زور سے قہقہہ بلند کیا کہ کمرے کی چھت اُڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بمشکل ہنسی پر قابو پا کر بولی:

''مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ تمھاری سوچ ہے۔ تم پچھلے بیس بائیس برس سے (West) میں رہ رہے ہو۔ پڑھے لکھے ہو، کھلا ذہن رکھتے ہو مگر اب بھی پُرانے زمانوں کے دقیانوسی یقین تمھاری سائیکی میں رینگ رہے ہیں۔''

''تم کچھ بھی کہہ لو...... لیکن سچ یہ ہے کہ مَیں اولاد کا منہ دیکھے بغیر مرنا نہیں چاہتا۔ میں اس میں اپنی شکل، اپنی ذات دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ آگے چل کر میرے نام کو دنیا میں زندہ رکھے گی۔''

میرا واضح موقف جان کر وہ اس قدر سنجیدہ ہوگئی تھی کہ وہ کوئی دوسری ہی عورت دِکھ رہی تھی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبی جانے کیا سوچ رہی تھی؟ میں وثوق سے کہہ نہیں سکتا۔ پھر یکبارگی اس کا چہرہ بامعنی مسکراہٹ سے منور ہوگیا۔ گویا اس نے چند ہی لمحوں میں آنے والی زندگی کا تعین کرلیا ہو۔ بڑھ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی اور اپنے لب میرے کان کے قریب لا کر آہستہ سے کہا:

''آج تم نے منطق کا دامن چھوڑ دیا.... حیرت ہے؟ لیکن میں تمھاری خواہش کی قدر کرتی ہوں۔''

وہ مجھے گومگو کی حالت میں چھوڑ کر لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔

کوئی دن ایسا نہ گزرتا جب میں جولیا سے کبھی اشاروں میں، کبھی ڈھکے چھپے جملوں میں اور کبھی براہِ راست دریافت نہ کرتا کہ اس نے فیملی کو بڑھانے کی خاطر کیا فیصلہ کیا ہے؟ لیکن وہ کبھی اوں ہاں کر کے خاموش ہوجاتی۔ کبھی مسکرا دیتی اور کبھی موقع پا کر موضوع بدل دیتی۔ میری خواہش ہر گزرتے دن کے ساتھ شدت اختیار کرتی چلی جارہی تھی اور میری آنکھیں اولاد کا منہ دیکھنے کو ترس رہی تھیں۔ ایک شام کام سے فارغ ہو کر میں گھر پہنچا۔ لاؤنج میں داخل ہو کر میں نے جولیا کو آواز دی۔ وہ مجھ سے پہلے گھر چلی آیا کرتی تھی۔ مسلسل آوازیں دینے پر بھی جب کوئی جواب نہ ملا تو اسے کمروں میں تلاش کیا۔ کھانے کی میز کے وسط میں میرے نام کا ایک لفافہ رکھا

تھا۔

''بھی، کافی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ تمھاری خواہش اور میرا فیصلہ آپس میں روز روز ٹکرائیں، تکرار ہو اور ہماری زندگیاں تلخ ہو کر اس گھر کو جہنم بنا دیں؟ بہتر یہی ہوگا کہ ہم الگ ہو جائیں۔ مَیں تم کو چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ جلد ہی میرا سالی سٹر تم سے فنانس، بینک اکاؤنٹ، فلیٹ، مورگیج اور دیگر امور کے متعلق رابطہ کرے گا۔

میں آج بھی تم کو پسند کرتی ہوں۔ تم نیک سیرت شخص ہو۔ مخلص اور ایماندار۔ دوسروں کے کام آنے والے۔ مگر اب تم اپنی خواہش کے غلام بن چکے ہو، جبکہ میری منزل بالکل الگ ہے۔ گڈ بائے۔''

جولیا

۴

ہر شخص کے حالات ایک سے نہیں رہتے کہ وہ تغیر پذیر ہیں۔ آدمی سماجی، معاشی اور داخلی طور پر بدلتا رہتا ہے۔ تارا کے جیون میں بھی کئی انقلاب آئے اور اپنی گہری چھاپ چھوڑ کر آئندہ کی تبدیلیوں کے لیے جگہ بنا گئے۔ اس نے کئی بار اپنے بدلتے ہوئے حالات مجھے فون پر بیان کیے۔ کبھی ای میل کا سہارا لیا اور کبھی تفصیلی خط تحریر کیا۔ میری کہانی ''مسیحا'' کا ترجمہ جو فرانسیسی اخبار ''لا فگارو'' کے ادبی حصے میں شائع ہوا تھا، اس کا تراشا پا کر مجھے بے پناہ خوشی ہوئی۔ کہانی کے حوالے سے اگلے شمارے میں چند تعریفی خطوط بھی شائع ہوئے تھے۔ تارا نے فون پر جب آگاہ کیا تو میں نے بے ساختہ اس سے کہا تھا کہ وہ مجھے انٹرنیشنل رائٹر بنانے پر کیوں تلی بیٹھی ہے؟ دیر تک ہماری ہنسی ایک دوسرے کے کانوں میں مٹھاس چھوڑتی رہی۔ سات سمندر پار رہ کر بھی ہم قریبی اور مخلص دوست ثابت ہو رہے تھے اور ہمارے درمیان عجیب سا تال میل پیدا ہو رہا تھا، جسے ہم ہزاروں میل کی دوری سے بھی محسوس کر رہے تھے۔ پچھلی مرتبہ جب وہ لندن آئی تھی تو

میں ہی اُسے ہیتھرو ایرپورٹ سے ہلٹن انٹرنیشنل میں لایا تھا (گو ٹریفک میں پھنس جانے کے کارن مَیں وہاں دیر سے پہنچا تھا) کمرے میں سامان رکھتے ہوئے تارا نے بتایا تھا کہ دیر شام میں اُس کا شوہر ویانا سے کانفرنس کے بعد سیدھا لندن پہنچ رہا ہے۔ ہمارے درمیان قریب قریب تین گھنٹے اپنے تھے۔ ہم نے دنیا بھر کی باتیں کیں۔ سماجی، سیاسی، ادبی اور نجی۔ میرے طلاق کے تعلق سے اس نے صدق دل سے ہمدردی جتائی تھی۔ بلکہ افسوس بھی ظاہر کیا تھا کہ جولیا مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اس کے فیصلے پر تارا نے حیرت کا اظہار بھی کیا تھا کہ اس نے سماجی حیثیت کی خاطر اپنی کامیاب شادی قربان کر ڈالی ہے۔ بات چیت کے دوران اس نے اپنے ناول کا بھی ذکر کیا تھا۔ وہ دن رات اس پر سنجیدگی سے کام کر رہی تھی۔ موضوع اس نے یہ بتایا تھا کہ ڈبلیو ایچ او (W.H.O) کے کئی اونچے رتبوں پر فائز آفیسرز انٹرنیشنل کمپنیوں سے سستی دوائیں بنوا کر افریقہ کے پس ماندہ علاقوں میں سپلائی کرتے ہیں اور یوں وہ کرپٹ آفیسرز اپنا بینک بیلنس بڑھا رہے ہیں۔ وہ دوائیں زیادہ اثر نہیں رکھتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان قحط زدہ علاقوں میں اموات تیزی سے بڑھ رہی ہیں اور جانے کب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا؟

۵

تارا واقعی سنیچر کے روز پانو میں چکر لیے پیدا ہوئی تھی۔ سنیچر دیوتا جو دیو مالا میں شنی کے لقب سے جانا جاتا ہے، سوریہ اور چھایا کا بیٹا ہے۔ اکثر سیاہ فام گھوڑے پر سوار دِکھائی دیتا ہے اور مشکلات سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن مسلسل سفر اس کا مقدر ٹھہرا ہے۔ وہ تارا کے تن من پر یوں طاری رہتا کہ وہ زیادہ تر سفر میں ہی رہا کرتی۔ بعض دفعہ وہ اوب بھی جاتی مگر مختلف مقامات کی زیارت کرنا اس کا اولین مشغلہ تھا اور ہر تفریح کے بعد اسے روحانی مسرت بھی ملا کرتی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی اور تنہا اولاد تھی۔ اس کے والد ماجد ہند سرکار کے بزرگ سفیر تھے۔ جس کارن اس

نے بچپن سے بالغ ہونے تک دنیا کی کئی راجدھانیاں دیکھ لی تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے برس والد کے تبادلے پر ملک کے ساتھ راجدھانی بھی بدل جایا کرتی۔ ماسکو، لندن، تہران، پیرس، بان اور اسلام آباد۔ وہ ان شہروں کے طول و عرض سے خوب خوب واقف تھی۔ اس کا بچپن پیرس میں گزرا تھا اور وہیں اس نے ابتدائی تعلیم بھی پائی تھی۔ وہاں کی معاشرت، ثقافت اور طرزِ زندگی نے اس پر اتنا اثر کیا تھا کہ وہ فرانسیسی زبان بھی روانی سے بولنے لگی تھی۔

تارا کی شادی ڈاکٹر بسواس سے دہلی میں، وہاں برسوں سے آباد بنگالی برادری کی موجودگی میں بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ شہر کی برگزیدہ شخصیات، سرکاری عہدے دار، دانشور، ڈاکٹرز، تجارتی لوگ اور فارن سروس کے نمائندوں نے شرکت کی تھی۔ لیکن بیاہ سے پہلے، جن دنوں تارا کی کورٹ شپ ڈاکٹر بسواس سے چل رہی تھی، اس نے ملاقاتوں کے دوران ڈاکٹر بسواس سے پہلے تو ہلکے ہلکے اشاروں میں، پھر علامتی انداز میں اور انجام کار کھلے لفظوں میں گوش گزار کیا تھا کہ وہ ایک ہی مقام پر زیادہ دیر ٹک کر نہیں رہ پاتی۔ اس کا من اوب جاتا ہے۔ نہ ہی وہ کسی ایک شخص کے ساتھ زیادہ وقت گزار سکتی ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ دور دور تک قدم بڑھا سکتی ہے۔ کارن یہ ہے کہ وہ اس شخص کی دہرائی ہوئی باتیں، عادتیں، مشغلے اور رویے برداشت نہیں کر پاتی۔ تبدیلی چاہتی ہے۔ آدمی کو ماحول، اقدار، حالات اور وقت کے ساتھ ساتھ بدلنا چاہیے۔ مگر سچ کا دامن وہ کبھی نہ چھوڑے۔ ورنہ روزمرہ کی یکسانیت اسے دیمک کی طرح چاٹ جائے گی اور پچھتاوا اس کا مقدر بن کر رہ جائے گا۔ لیکن لوگ باگ اس کی باتیں سن کر اور اس کے رویوں کو جان کر اس کا مذاق اُڑایا کرتے ہیں۔ بعض اسے نیم پاگل، سنکی اور بھانوری بھی قرار دیتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر بسواس اس کی صاف گوئی، جرأت اور بے باک رویوں پر مرمٹا تھا۔ جبکہ تارا سانولی رنگت کی معمولی شکل و صورت کی عورت تھی۔ مگر اس کی بڑی بڑی آنکھیں اتنے غضب کی تھیں کہ وہ بنگال کا جادو جگاتی تھیں اور آدمی ان میں کھو کر رہ جاتا تھا۔ اس کا بدن بھی بڑا کسا کسا تھا، جس کا ہر حصہ مقناطیسی کشش رکھتا تھا۔ وہ بذاتِ خود تیز فہم، روشن دماغ اور حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر رکھتی تھی۔ ادب سے بھی اس کا لگاؤ گہرا تھا۔ اس نے بنگلہ زبان کی چند کہانیاں غیر ملکی

زبانوں میں ترجمہ کر کے ادبی حلقوں میں اپنی پہچان بنالی تھی۔ان اوصاف کے پیش نظر کوئی بھی سلجھا ہوا باذوق شخص اس پر آسانی سے فدا ہوسکتا تھا۔ پھر ڈاکٹر بسواس کیونکر بچ رہتا؟ اسے اپنی دلکش شخصیت، سماجی حیثیت، باعزت پیشہ اور خاندانی دولت پر اتنا غرور تھا کہ وہ تارا کو دنوں میں ہی رام کرلے گا اور وہ بے چین آتما اِدھر اُدھر بھٹکنا بند کر دے گی۔ جب وہ اس کے ہمراہ بیرون ملک میڈیکل کانفرنسوں اور سمیناروں میں جایا کرے گی تو وہاں ڈاکٹروں اور سرجنوں کے لیکچر سن کر حیاتیاتی زندگی کے متعلق اس کا شعور مزید بڑھے گا۔پھر اپنے دیش میں ہر ویک اینڈ پر جب وہ پارٹیوں اور کاک ٹیل پارٹیوں میں شامل ہوگی، کبھی اپنے کشادہ فلیٹ میں اور کبھی دوستوں کی رہائش گاہ پر تو یقیناً وہ ان کی آزاد سوچ سے متأثر ہوگی۔ پھر جب وہ پانچ ستارہ ہوٹلوں میں سرمایہ داروں کے درمیان بیٹھی ڈنر کرے گی اور کروڑوں، اربوں کی لاگت سے پرائیوٹ ہاسپٹل کھولنے کا منصوبہ جانے گی تو وہ اس کے ساتھ خود پر بھی ناز کرے گی۔ نیا ماحول، نئے لوگ اور نئی زندگی شرطیہ اسے راس آئے گی اور ماں بننے پر تو اس کی کایا پلٹ کر ہی رہ جائے گی۔ جب اسے احساس ہوگا کہ بال بچوں کے ساتھ عورت کی اصلی دنیا اس کا گھر ہی ہوا کرتا ہے۔ جسے بنا سنوار کر وہ اُسے جنت بنانے میں کوشاں رہتی ہے۔لیکن بدقسمتی سے ڈاکٹر بسواس نے جن خطوط پر سوچا تھا یا تصور کی آنکھ سے دیکھا تھا، وہ عملی صورت اختیار نہ کر پایا۔اسباب واضح تھے کہ جب مخالف اور متضاد رویے آپس میں ٹکراتے ہیں تو میاں بیوی کے درمیان انجام اکثر جدائی، طلاق، جبر، گھریلو تشدد یا قتل کی صورت میں ہوا کرتا ہے۔تارا اور بسواس کے درمیان بھی تلخی کے ساتھ اختلافات بڑھتے رہے۔ایک شب ڈاکٹر نے ڈنر کے بعد تارا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے پیار کرنا چاہا۔مگر اس نے رضامندی ظاہر نہ کی۔ بلکہ ڈاکٹر کا ہاتھ ہٹا کر دوٹوک لہجہ اختیار کیا:

''شادی سے پہلے میں تم کو پسند کرنے لگی تھی۔مگر وقت بیت جانے پر اب تم میرے لیے پُرانے ہو چکے ہو۔میں تم کو اندر باہر سے جان گئی ہوں۔''

''پھر؟''

''میں تبدیلی چاہتی ہوں؟''

ڈاکٹر سیانا تھا اور ہر سیانا آدمی دور کی سوچتا ہے۔ ڈاکٹر نے دنیا دیکھ رکھی تھی۔ یوں بھی وہ ایک عرصے سے محسوس کر رہا تھا کہ تارا اس سے کھنچی کھنچی سی رہنے لگی ہے۔ اس کی شکایات بھی بڑھ رہی ہیں۔ مگر وہ اس کی ہر شکایت کو سنی ان سنی کرتا رہا۔ اپنائیت سے بولا:

''یہ تبدیلی کل پر چھوڑتے ہیں۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اگلی شام وہ لاؤنج میں خاموش بیٹھے دور درشن کے چینل پر کوئی سنجیدہ ڈاکومینٹری دیکھ رہے تھے۔ پروگرام عورت ذات کی مظلومیت اور اس کی سماجی محرومیت کے متعلق تھا۔ مرد ذات نے کتنی عیاری سے عورت کو کمزور جان کر اس کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھایا تھا اور اس کا جنسی استحصال بھی کیا تھا۔ بلکہ ذاتی ملکیت سمجھ کر اسے آزادی سے بھی محروم رکھا تھا۔ مگر جدید دور میں عورت تمام BARRIERS کو توڑ کر اپنے حقوق طلب کر رہی تھی اور مرد بے چارہ پریشان تھا۔ میاں بیوی اپنی اپنی سوچ میں گم، نشہ آور مشروب کے گھونٹ بھرتے، گلاس بھی بدل رہے تھے۔ تارا محسوس کر رہی تھی کہ قدرت نے مرد کو جو مخصوص لنگ عطا کیا ہے، وہ اس کے ذریعے عورت کی جسمانی اور حیاتیاتی ضرورت پوری کرتا ہے اور اسی کے ذریعے ہی آئندہ نسلیں وجود میں آتی ہیں۔ اگر قدرت اس پر مہربان نہ ہوتی تو عورت اس سے دور کا بھی واسطہ نہ رکھتی۔ دوسری طرف ڈاکٹر محسوس کر رہا تھا کہ عورت کی سب سے بڑی ضرورت مرد رہی ہے اور وہ ابد تک رہے گی۔ وہ اس کی صحبت کے بغیر نامکمل ہے۔ لیکن وصال کے دوران اگر مرد اسے کسی وجہ سے مطمئن نہ کر پائے تو وہ تبدیلی چاہتی ہے۔ وہ کوئی دوسرا ٹھکانا تلاش کرتی ہے۔ ڈاکومینٹری ختم ہوئی تو تارا کے کہنے پر ملازمہ نے کھانا پروس دیا۔ میاں بیوی نے کچھ کھایا کچھ نہیں کھایا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر نے بڑھ کر اپنا بازو تارا کی کمر کے گرد پھیلا دیا۔ اس نے بھی اپنا بازو ڈاکٹر کی کمر میں ڈال کر رضامندی ظاہر کی اور یوں وہ جڑے ہوئے عالیشان خواب گاہ میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر نے بڑے چاؤ سے کہا:

''ڈارلنگ، مجھے دو تین منٹ دے دو میں باتھ روم سے ہو کر آتا ہوں۔ بس گیا اور آیا۔''

لیکن ڈاکٹر نے لوٹنے میں سات آٹھ منٹ لگا دیے اور جب وہ تارا کے قریب آیا تو الگ ہی شخص

تھا۔انار چہرہ، انگارہ آنکھیں، کھڑے بال اور سُرخ گالوں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے۔ بدنی کھیل شروع ہوا تو ڈاکٹر دیر تک تارا کا انگ انگ بھنبھوڑتا رہا، چومتا رہا، چاٹتا رہا۔اس نے تارا کے بدن پر جگہ جگہ دانتوں کے نشان بھی چھوڑے۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ ڈاکٹر کا پیار کرنے کا ڈھنگ بالکل بدلا بدلا سا ہے۔اتنے زور وشور سے اس نے کبھی پیار نہ کیا تھا اور نہ ہی اسے کبھی جانور کی طرح کاٹ کر اس کی ہر حس کو بیدار کیا تھا۔ وہ قوتِ مردانگی کا بھرپور اظہار کر رہا تھا۔تارا حیران تھی اور پریشان بھی کہ ڈاکٹر میں یہ تبدیلی کیونکر چلی آئی ہے؟ دونوں معمول سے زیادہ دیر تک، دنیا سے بے خبر خود میں مشغول رہے۔ وہ پسینے سے تر بتر تھے۔ان کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں اور بال یوں بکھر چکے تھے کہ ہفتوں انھیں سنوارا نہ گیا ہو۔ کچھ دیر میں وہ بستر سے اُٹھے تو لگا کہ انھوں نے ابھی ابھی غسل کیا ہے۔ بوندیں فرش بوس ہو رہی تھیں ۔ڈاکٹر کا سینہ پھول کر دوہرا ہوا جا رہا تھا اور وہ فخریہ تارا کو دیکھ کر احساس دلا رہا تھا کہ اس نے تارا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فتح کر لیا ہے۔ وہ بھی خوش تھی کہ اس کے ہر انگ کا ہر مسام مدتوں بعد کھلا تھا۔لیکن اس نے بستر سے چادر کھینچ کر اپنا جسم ڈھانپ لیا تھا اور مضبوط لہجہ اختیار کیا:

''ڈاک، میری پرابلم سیکس نہیں، کچھ اور ہے؟''

''وہ کیا ہے؟'' اس نے فتح کے نشے میں کہا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ آدمی کو ماحول، اقدار، حالات اور وقت کے ساتھ ساتھ بدلنا چاہیے۔مَیں ایک سی زندگی جی نہیں سکتی۔ مجھے شروع میں تمھاری دنیا پسند آئی تھی۔ میں نے خود کو بدلا بھی تھا۔''

''پھر؟''

''اب مجھے تبدیلی چاہیے؟''

ڈاکٹر نے ماتھے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے اپنا فخریہ لہجہ برقرار رکھا:

''آج کے بارے میں کیا خیال ہے؟....تبدیلی ضرور محسوس کی ہو گی تم نے؟''

''ہاں۔لیکن میں کوئی NYMPHO نہیں ہوں...... بیڈ روم میں داخل ہو کر تم نے دو تین منٹ کی

اجازت چاہی تھی۔ مگر پلٹ کر آئے تو سات آٹھ منٹ بیت چکے تھے۔ اس دوران تم نے انٹراوینس (INTRAVENOUS) انجکشن لیا ہے۔ اس کا اثر جب تم پر ہوگیا تو تم نے میری طرف رُخ کیا۔''

ڈاکٹر کا اُبھرتا ہوا سینہ یک بیک اندر کی جانب چلا گیا۔ چہرے کی ہلکی سانولی جلد گہری ہوگئی۔ وہ بازی ہار چکا تھا۔ قریب ہی رکھی ہوئی چمڑے کی کرسی پر وہ بیٹھ گیا۔ تارا اُسے ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھتی رہی۔ پھر چہرے پر حقارت ابھرتے ہی وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

اس رات وہ ایک ہی پلنگ پر سوئے تھے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کی طرف پشت کیے دراز تھے۔ اُن کے درمیان دیر تک کوئی بات نہ ہوئی۔ لگتا تھا کہ ان کا تعلق ایک لمبے فاصلے میں بدل گیا ہے اور فاصلہ بھی ایسا کہ جو کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی رہے گا اور ایک انجانے موڑ پر پہنچ کر ختم ہوجائے گا۔

صبح ڈاکٹر اپنے وقت پر اُٹھا کہ اُسے سرجری پہنچنا تھا۔ وہ وقت کا بڑا پابند تھا۔ تارا اس کے ساتھ ہی اُٹھ جایا کرتی تھی۔ پھر ڈاکٹر کے واسطے اس کی پسند کا بریک فاسٹ تیار کرتی، جسے ملازمہ پروس دیا کرتی تھی۔ لیکن اس صبح تارا کو آس پاس کا کوئی ہوش نہ تھا۔ وہ گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی۔ اس کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے ایک دو بار اُسے آواز دے کر اُٹھانا بھی چاہا، مگر بے سود۔ وہ گہرے خراٹے بھر رہی تھی۔ ڈاکٹر تیار ہوا اور ناشتہ کیے بغیر ہی سرجری کو چلا گیا۔ سورج کی تمازت بڑھی تو ملازمہ نے بیڈروم میں داخل ہوکر تارا کو اُٹھایا۔ اس نے غسل کے بعد سیر شکم ناشتہ کیا پھر ضروری سامان باندھا اور کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھ گئی۔

''بسواس۔ میں جا رہی ہوں سدا کیلیے۔ اب میں تمھارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ جو اہم باتیں مَیں لکھنے جا رہی ہوں ان سے تمھارے کان خوب خوب واقف ہیں۔ لیکن تم نے ان پر سنجیدگی سے کبھی غور نہیں کیا اور نہ ہی ان کی اہمیت کو جانا۔ مجھے افسوس ہے۔ تم نے اپنے اردگرد جو دنیا بسا رکھی ہے، وہ شروع میں مجھے راس ضرور آئی تھی اور میں خوش بھی تھی۔ شعوری طور پر مَیں خود کو بدل بھی رہی تھی۔ لیکن ملک در ملک کانفرنسوں اور سمیناروں میں جا کر اور وہاں مغربی ڈاکٹروں اور سرجنوں

سے مل کر اور ان سے تفصیلی گفتگو کرنے پر یہ کھلا کہ وہ سب مغربی دنیا کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ وہ مستقل وہاں رہنا پسند کرتے ہیں کہ وہاں دولت کی بہتات ہے۔ لیکن تیسری دنیا کے ملکوں کا ذکر آنے پر ان کے چہروں کی چمک ماند پڑ جاتی ہے اور وہ خاموش رہ کر یہ تأثر دیتے ہیں کہ انسانیت کی خدمت کرنا اور غریب غربا کا علاج کرنا اب عہدِ رفتہ کی کوئی حسین شے تھی۔ تمھاری کاک ٹیل پارٹیوں میں مجھے بہت کم ایسے لوگ ملے جو اخلاقیات کے دائرے میں رہ کر سانس بھرتے ہوں۔ ورنہ بیشتر کے پانو اخلاقی پستی کی طرف جلد ہی پھسل جاتے ہیں۔ ان کے حریص، مصنوعی، گھناؤنے چہرے دِکھنے میں آتے ہیں۔ رہے تمھارے قریبی اور وفادار دوست تو بیشتر کے پاس وہی دہرائے ہوئے پٹے پٹائے لطیفے ہیں، فحش مذاق ہیں اور سستی باتیں ہیں۔ بعض کی تو نظر بھی میلی ہے۔ وہ میرے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں، جبکہ وہ شادی شدہ ہیں اور بال بچے دار بھی۔ مَیں تمھارے ساتھ پانچ ستارہ ہوٹلوں میں اپنے دل پر پتھر رکھ کر جایا کرتی تھی۔ یقین جانو وہ مقامات مجھے ایک پل نہ بھایا کرتے۔ جہاں کا ماحول نمائشی ہو، لوگوں کی باتوں میں کھوکھلا پن ہو، جھوٹ ہو۔ ہر کوئی خود کو بڑھا چڑھا کر پیش کرے اور منافق ہونے کا احساس دلائے، اُن جگہوں کو مجھ جیسی عورت کیونکر پسند کرے گی؟ درحقیقت سچ تمھاری دنیا کے قریب سے نہیں گزرا اور مَیں سچ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ تم کو تمھاری دنیا مبارک ہو۔ تمھارے یار دوست اور تمھارا زیرِ تعمیر ہسپتال بھی مبارک ہو۔ مجھے میری دنیا بلا رہی ہے۔ چونکہ مَیں خود تم کو چھوڑ کر جا رہی ہوں، میں تم سے روپے پیسے کی کوئی امید نہیں رکھتی۔ یوں بھی میرے والدین میرے واسطے اتنا کچھ چھوڑ کر رخصت ہوئے ہیں کہ وہ اگلے جنم میں بھی شاید ہی ختم ہو۔ آخر میں یہ لکھنا بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ کل رات جو گھٹیا، ذلیل اور گھناؤنی حرکت تم نے کی ہے، وہ بھلائے نہیں بھولے گی۔ انجکشن لیتے وقت تمھیں ذرا بھی خیال نہیں آیا اور نہ ہی تم نے سوچا کہ تارا تمھاری بیوی ہے؟ کوئی بازاری عورت نہیں؟ HELL WITH YOU

تارا

٦

سال کی آخری شام میں ٹرافلگار اسکوائر اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی سڑکوں پر عوام ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو رہے تھے۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ سفید، پیلے، سانولے اور سیاہ فام لوگ ہر سو موجود تھے۔ سب کو انتظار تھا کہ کب سالِ رواں اپنا آخری لمحہ سالِ نو میں ضم کر کے نیا باب شروع کرے۔ تارا میری کمر میں بازو پھیلائے مجھے گرفتار کیے کھڑی تھی۔ اندھیرا گاڑھا تھا۔ فضا یخ تھی اور ہوا سرد تھی۔ لیکن چاروں طرف نگاہ دوڑانے پر بھی مجھے وہاں کوئی شخص ایسا دِکھائی نہ دیا جو گرم کپڑوں میں ملبوس نہ ہو۔ سردی جب مجھے زیادہ پریشان کرتی تو میں بڑے کوٹ کی جیب سے ہِپ فلاسک نکال کر وہسکی کے دو تین گھونٹ بھر لیتا اور پھر اُسے تارا کی طرف بڑھا دیتا۔ وہ ایک آدھ گھونٹ بھر کر جھرجھری لیتی اور پھر اُس کی نگاہیں بگ بین (BIG BEN) کے گھڑیال کی طرف اُٹھ جاتیں، جو ہم سے زیادہ دور نہ تھا۔ ہم نیشنل گیلری کی سیڑھیوں پر لوگوں میں دبکے کھڑے تھے۔ متحرک سوئیوں کا گلے ملنے کا وقت قریب ہی تھا۔ موسیقی جگہ جگہ سے اُبھر رہی تھی۔ اُمڈتی ہوئی خلقت بے چین تھی۔ پھر وہ پل بھی آ گیا جب سوئیاں بارہ کے ہندسے پر پہنچ کر ایک اکائی کی صورت اختیار کر بیٹھیں اور گجر نے بج کر سارے میں نئے سال کی آمد کا اعلان کر ڈالا۔ روشنیاں روشن ہوئیں تو ٹرافلگار اسکوائر کے اردگرد عمارتیں ساؤتھ افریقہ ہاؤس، کینیڈا ہاؤس اور نیشنل گیلری سب جگمگا اُٹھے۔ شور و غوغا ایسا بلند ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ آکاش چراغاں ہو گیا۔ میں نے جھک کر تارا کے گال پر اپنے ہونٹ رکھ دیے اور اُسے چوم کر نئے سال کی مبارکباد دی۔ وہ بے انتہا خوش ہوئی اور اُسی جوش کے تحت اس نے اچک کر میرے گال پر جوابی حملہ کر ڈالا۔ پھر ہم لپٹے لپٹائے عوامی رقص کا حصہ بن گئے۔ لوگ پی پلا رہے تھے، لپٹ رہے تھے، رقصاں تھے اور شور مچا رہے تھے۔ دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر عوام کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہونا شروع ہوئی تو ہمیں بھی خیال آیا کہ ہمارا بھی کوئی گھر ہے، جہاں پہنچ کر ہمیں دن بھر کی تھکان

دور کرنی ہے۔ تارا نے اسکوائر پر بھرپور الوداعی نظر ڈالی اور اُسے خود میں اُتار کر میرا بازو تھامے انڈر گراؤنڈ اسٹیشن کی طرف بڑھ گئی۔ مسافروں سے لدی گاڑی میں، ہم ان کے شور شرابے میں، اپنے اسٹیشن پر بمشکل اُترے اور قہقہے لگاتے راہگیروں کو نئے سال کی مبارکباد دیتے ہوئے اپنے گھر پہنچے۔ مَیں نے فلیٹ کا دروازہ کھولا اور تارا کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ داخل ہوئی تو ابھی بلب روشن ہی ہوا تھا کہ تارا نے اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور صدق دل سے کہا:

''بمل، آج میں اتنی خوش ہوں کہ بیان نہیں کر سکتی ...... اب میں دن بھر کا ہر واقعہ، ہر منظر اپنی کتاب میں لکھ سکتی ہوں ...... یوں تو میں یہ سب اکیلی بھی نظارہ کر سکتی تھی۔ مگر عورت اکیلی ہو تو گِدھ اس کے اردگرد منڈلانے لگتے ہیں۔''

''آج میں بھی بہت خوش ہوں کہ تم میرے ساتھ تھیں۔ ورنہ میں ایک عرصے سے اکیلا ہی بھٹکتا پھرتا ہوں اور دنیا تاریک سی لگا کرتی ہے۔''

وہ بالکل میرے جسم سے لگ گئی:

''آج دن بھر ہم ساتھ رہے۔ تمھارا احسان تو چکانا ہوگا؟''

اُس کی آنکھوں کی تحریر کو پڑھ کر میں نے اگلا پل ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ فوراً ہی اُسے اُٹھا کر بانہوں میں بھر لیا اور سیدھا بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔

نئے سال کی پہلی شام میں تارا کی فلائیٹ یوگینڈا کے شہر کمپالا کے لیے بُک تھی۔ ہم دیر سے اُٹھے تھے۔ لیکن اس کے باوجود تارا نے دوپہر کا کھانا تیار کر لیا تھا۔ مجھے ایک طویل عرصے کے بعد ایک ہندوستانی عورت کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا پچھلے آٹھ دس دنوں سے نصیب ہو رہا تھا اور میں خوش تھا۔ وہ جب سے آئی تھی، اس نے کچن پر قبضہ کر لیا تھا۔ طرح طرح کے لذیذ کھانے وہ بنا دیا کرتی تھی۔ مَیں نے جب کبھی کچن میں داخل ہو کر اس کی مدد کرنا چاہی، وہ دہلیز پر ہی میرا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی اور کندھے اچکا کر ادائے خاص سے کہتی:

''ہمارے پُرکھوں نے جب ''دھرم گرنتھ'' لکھے تھے تو گھر کا چولھا اور رسوئی ناری کے نام لکھ چھوڑا

تھا...... بولو اب کیا کہتے ہو؟''

مَیں کیا کہہ سکتا تھا۔ خاموش اُسے دیکھا کرتا اور اس کی ہر ادا، ہر بول کو سراہ کر الگ ہو جاتا اور سوچتا کہ اس عورت کے ہاں سچ کے ساتھ علم کا خزانہ بھی موجود ہے۔

ہم کھانے کی میز پر روبرو بیٹھے مچھلی کے خوش ذائقہ قتلے چکھ رہے تھے۔ اس نے کاڈ مچھلی کو بیسن، انڈوں اور مسالوں میں گھول کر تل لیا تھا۔ پھر کھاتے وقت وہ جس ڈھنگ سے اُن قتلوں کے ساتھ انصاف کر رہی تھی، وہ اپنی جگہ کمال تھا۔ مَیں سمجھ سکتا تھا کہ بنگالن ہونے کے کارن وہ مچھلی کی دلدادہ ہے۔ مجھے اس کی موجودگی اپنے گھر میں نہایت بھلی لگ رہی تھی۔ دل نے چاہا کہ وہ چند دن مزید رک جائے اور ہم اسی طرح کھاتے پیتے، ہنستے کھیلتے ایک دوسرے کو مزید جان کر وقت گزار دیں۔ کچھ دیر میں جب اس کی پلیٹ قریب قریب خالی ہو چکی تو میں نے دھیرے سے کہا: ''تارا۔ پلیز، آج مت جاؤ۔ کچھ دن اور رک جاؤ''

وہ میرے غیر متوقع سوال پر چونک اُٹھی۔

''اگلے ہفتے چلی جانا؟''

اس بار اُس نے مجھے نہایت غور سے دیکھا کہ میرے من میں کیا ہے اور میرے سوال کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ وہ میری التجا کا بھرم رکھنے والی ہے مگر اُس کا جواب انکار میں تھا۔

''نہیں بمل، میرا آج شام میں کمپالا جانا نہایت ضروری ہے۔ کل ڈبلیو ایچ او (WHO) کے چند ذمہ دار نمائندوں سے ملنا ہے۔ وہ مجھے اس ادارے کے کرپٹ آفیسرز اور ویسٹرن کمپنیوں کے متعلق اہم معلومات مہیا کرنے والے ہیں۔ ورنہ کتاب ادھوری رہ جائے گی۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' میں چار و ناچار پلیٹ پر جھک گیا۔

''مگر تم اتنی فکر کیوں کرتے ہو؟ مَیں ملٹی پل ویزا لے کر آئی ہوں۔ کبھی بھی تمھارے پاس آ سکتی ہوں۔''

''ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔'' مَیں نے سر اُٹھائے بغیر کہا۔

''اب میں ڈاکٹر سے آزاد ہو چکی ہوں..... دوسری بات، میرے پانو کا چکر ابھی ختم نہیں ہوا۔''

یہ کہہ کر وہ ہنس دی۔ پھر اپنا اندرون سنجیدگی سے واضح کیا:
''اس کم بخت چکر نے مجھے پریشان کر رکھا ہے اور تنگ الگ سے۔ جانے یہ کب، کہاں اور کس صورت میں ختم ہوگا؟ مگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو میں اس کے بغیر ادھوری ہی ہوں۔''

تارا مجھے نوے لاکھ باسیوں کے شہر میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ایک ہی چھت کے نیچے دس روز تک اکٹھے رہتے رہتے میرے ہاں جینے کی بھرپور تمنا جاگ اُٹھی تھی۔ خاص طور پر نئے سال کی پہلی رات میں، جب تارا خود سپردگی کے عالم میں پیش پیش تھی اور مَیں بھی مدت سے عورت کے نرم گرم جسم سے محروم تھا۔ اس نے جسمانی وصال کے دوران میرا کان ہلکا سا کاٹ کر سرگوشی کی تھی:
''بمل۔ تم واقعی ذات کے اصلی پنجابی ہو۔''
مَیں بے ساختہ ہنس دیا تھا اور اپنے متحرک بدن کو قدرے روک کر سرگوشی کی تھی:
''یہ سب تمھاری صحبت کا اثر ہے۔ پھر تمھارے ہاتھوں کے بنے پکوان کھا کھا کر جوانی لوٹ آئی ہے۔''
بدنوں کے ساتھ قہقہے بھی مدغم ہو گئے۔ بدن جاگ اُٹھے اور قہقہے دب کر رہ گئے۔

۷

میں جانتا تھا کہ تارا کے جانے کے بعد گھر کی برہنہ دیواریں مزید ویران ہو کر مجھے اپنے حلقے میں لینا شروع کر دیں گی۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ اس کی روانگی میری آتما میں دو تین نہیں تو ایک آدھ چھید ضرور کر جائے گی اور وہی ہوا۔ تقریباً ہر شام گھر لوٹنے پر جب مَیں اس اُمید پر کمپیوٹر کھولتا کہ تارا نے دنیا کے کسی کونے، کسی خطے، کسی شہر سے چھوٹا بڑا ای میل ضرور بھیجا ہوگا۔ لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ فون کی جواب دہ ریکارڈنگ مشین بھی خاموش تھی۔ موبائل کا تو ذکر ہی کیا؟ لیکن وقت جب ہفتوں میں بدل کر آگے بڑھ گیا تو دھیرے

دھیرے دھیرے میری ذہنی حالت بھی بدلتی چلی گئی اور مَیں محسوس کرنے لگا کہ تارا تو ایک گھنی بدلی تھی جو میرے دل و دماغ پر جم کر برسی اور چپکے سے آگے بڑھ گئی۔ لیکن جانے کیوں میرے من کے کسی کونے میں یہ یقین بھی بیٹھ چکا تھا کہ وہ کہیں اٹک کر رہ گئی ہے اور مجھ تک نہ پہنچنے کی وجہ بھی یہی ہے۔ ایک شام مَیں اخبار کا کالم ختم کر کے دیر سے گھر پہنچا۔ کمپیوٹر چند دنوں سے بند پڑا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن وہسکی پیتے وقت جب نشہ وسعت پیدا کر کے میرے جذبات کو بیدار کرنے لگا تو تارا چپکے سے میرے ذہن میں کنڈلی مار کر آن بیٹھی۔ چند گھونٹ اور پیئے تو تارا نے سرگوشی کی:

''بمل اُٹھو۔ جا کر کمپیوٹر کھولو۔ تمھارے نام کچھ آیا ہے وہاں۔''

جھٹ سے گلاس کو ایک طرف رکھ کر مَیں اُٹھا۔ کمپیوٹر کھول کر ای میل کا اِن باکس چیک کیا۔ واقعی تارا وہاں موجود تھی۔ تین روز سے اُس کا پیرس سے بھیجا ہوا ای میل میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں حواس باختہ ہو گیا اور اُسی عالم میں اِی میل کا متن پڑھنا شروع کیا۔ مگر سطریں اور الفاظ گڈمڈ ہو رہے تھے۔ حواس جب درست ہوئے تو نظر اور دماغ نے اپنا کام شروع کیا۔

ڈیر بمل۔

کمپالا جس مقصد سے آئی تھی۔ وہ دنوں میں ہی پورا ہو گیا تھا۔ ڈبلیو ایچ او، کے نمائندے مددگار ثابت ہوئے تھے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس ریکٹ کو دنیا کے سامنے لا کر مکار افسروں کو بے نقاب کیا جائے۔ مَیں پیرس جانے کو تیار بیٹھی تھی کہ سوڈان میں ڈارفور قحط کا قصہ چل نکلا۔ وہاں مدت سے آباد عرب مسلمان مقامی قبیلوں کے مسلمانوں کو صرف قتل ہی نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ اُن کی زمینیں، اُن کی آبادیاں اور اُن کے گھر بھی جلا رہے تھے۔ مَیں یو این (UN) کے چند ذمہ دار لوگوں کے ساتھ وہاں کیمپ میں مدد کرنے کو چلی گئی۔ لیکن وہاں بھوکی، ننگی، کچلی ہوئی مخلوق کے لیے نہ تو پانی تھا، نہ روٹی، نہ کپڑا اور نہ ہی دوائیں۔ پھٹے پُرانے خیموں میں پڑے ہوئے ہزاروں کی تعداد میں کنبے خاموش آنکھوں اور سلے ہوئے ہونٹوں سے آکاش کو ہر دم دیکھا

کرتے۔ لیکن جب گھڑ گھڑاتے ہوائی جہاز یا ٹرکوں کی آواز فضا میں اُبھرتی تو ہر کوئی کھانا کے پیکٹ اور پانی کی خاطر گرتا پڑتا دوڑتا دکھائی دیتا۔ مردار عوام کی بھگدڑ اور بھیڑ دیکھ کر بھگوان سے میرا وشواس اُٹھ جایا کرتا اور میں پربھو سے پوچھا کرتی کہ اُس کی دھرتی پر اُس کے پیدا کیے ہوئے بندے دانے دانے کو محتاج، کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگ کیوں رہے ہیں؟ لیکن پربھو خاموش رہتے۔ اُس سمے تم مجھے بے حساب یاد آتے۔ اس لیے کہ سنسار میں اب صرف تم ہی رہ گئے ہو، جس کی طرف میں بلا سوچے سمجھے دیکھ سکتی ہوں اور تم کو یاد بھی کر سکتی ہوں۔ مَیں نے دس روز جو تمھارے ساتھ گزارے تھے وہ میرے جیون کے انمول دن تھے۔ اُس کی اہم وجہ یہ بھی رہی کہ نئے سال کی آخری رات یا پہلے اُبھرتے دن میں، جب ہم نے ٹوٹ کر پیار کیا تھا تو تم چاہت بھرے موڈ میں تھے۔ میری کیفیت بھی بدلی بدلی سی تھی۔ آتماؤں کے ملاپ کے دوران وہ ایک دوجے کو زیادہ سے زیادہ پہچان رہی تھیں۔ آخر میں تم نے مجھ میں وہ بیج چھوڑا تھا کہ اب تم اپنی اولاد کا منہ دیکھے بغیر اپنے پربھو کے پاس نہیں جاؤ گے۔ دوسرا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ خوشیاں مناؤ کہ تمھاری جون سپھل ہوگئی ہے۔ تمھاری اولاد اب دنیا میں تمھارا نام چھوڑ کر جائے گی۔ رہا میرے پانو کا چکر تو اُسے ہمارے بچے کی پیدائش پر ختم ہی سمجھو۔ مجھے اپنے پہلوٹھی کے بچے کے پالن پوشن اور دیکھ بھال میں اپنا پورا جیون تج دینا ہوگا۔ تم کو بھی اپنی ذمہ داریاں نبھانی ہوں گی۔ میں جلد لندن آکر تمھارے پاس کچھ دن رکوں گی۔ مگر ہمارا وارث ہماری جنم بھومی بھارت میں جنمے گا۔ اور تمھارا وہاں موجود ہونا ضروری ہوگا۔ یہ سب قسمت کا کھیل ہے اور اس پر ہم بندوں کا کوئی اختیار نہیں۔

مَیں ای میل پڑھتے پڑھتے چھلانگیں لگا رہا تھا۔

☆☆

انوکھا سمبندھ

گھر میں کچھ اس قسم کا تناؤ پیدا ہو چکا ہے کہ مکان کی دیواریں بھی اُسے قریب سے محسوس کرنے لگی ہیں۔ چھوٹا سا گھر ہے اور چھوٹا سا پریوار۔ میں اور میری بیوی، جنھوں نے شادی کے روز رجسٹرار کے دفتر میں صدق دل سے یہ بول ادا کیے تھے کہ ہم امیری غریبی میں، غمی خوشی میں، بیماری تندرستی میں، دُکھ سُکھ میں اور ہر اونچ نیچ میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور آخری دم تک ساتھ بھی نبھائیں گے، اب اپنے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیے یوں بیٹھے ہیں، گویا ہم میاں بیوی نہ ہوں، بلکہ کسی مکان کے کرایہ دار ہوں، جن کا آپس میں کوئی رشتہ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ صورتِ حال میرے تن من اور ذہن پر اس قدر گراں گزر رہی ہے کہ میں سوچنے پر مجبور ہوں کہ گاڑی کا ایک پہیہ اگر ٹوٹ جائے یا بگڑ جائے تو گاڑی مزید چلنے سے انکار کر دیتی ہے۔ کچھ دیر پہلے ہمارے درمیان نہایت گرما گرم مکالمہ ہوا تھا اور ہم ایک دوسرے کو قصوروار اور خودغرض ٹھہرانے کی خاطر دنیا بھر کی دلیلیں دے رہے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے کہیں بھی نہیں پہنچ پا رہے تھے۔ آخر ایک مقام ایسا بھی آیا کہ میری بیوی حواس کھو کر چیخ اُٹھی تھی: ''اگر تم نے اس حد تک سوچ لیا ہے تو ٹھیک ہے تم

مجھے طلاق کیوں نہیں دے دیتے؟''

''یہ کام تم بھی تو کر سکتی ہو؟''

میرے جواب کی بھرپور تلخی، تیزی اور اس کی کاٹ کو وہ برداشت نہ کر پائی تھی۔ پانو پٹک کر فوراً اُٹھی، غضبناک نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ لگا کہ وہ مجھ پر حملہ کرنے جا رہی ہے۔ مگر میری طرف بڑھنے کی بجائے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اگلے پل دروازہ بند کرنے پر اتنے زور کا دھماکا ہوا کہ میرے کان سُن ہو کر رہ گئے۔ لیکن میرا ذہن خود بخود پیچھے کی طرف پلٹ گیا اور ماضی کے اوراق کھلتے چلے گئے۔ اچھی بھلی مجرد زندگی گزر رہی تھی۔ کوئی فکر فاقہ نہ تھا۔ میرے پاس ملازمت تھی، انگریز اور ایشیائی یار دوست تھے۔ اُن کی صحبت میں وقت گزر جاتا تھا، جسمانی ضروریات بھی پوری ہو جایا کرتی تھیں۔ لیکن میری ماں جو سات سمندر پار اپنے جدی اور پشتینی مکان میں قیام پذیر تھی، وہ میرے متعلق کچھ زیادہ ہی فکر مند تھی۔ اس کا بے حد اصرار تھا کہ میں اپنے دیش میں آ کر اپنی برادری میں ہی بیاہ کروں۔ اُسے ڈر تھا کہ میں پردیس میں کسی سفید فام یا غیر ذات کی عورت سے بیاہ نہ رچا لوں۔ بعد ازاں میرے رنگ دار بچے پیدا ہوں گے اور وہ وہاں کی اقدار، روایات اور طرزِ زندگی میں اس قدر ڈھل جائیں گے کہ وہ بذاتِ خود بچوں سے نہ تو اپنی زبان میں بات کر پائے گی اور نہ ہی انھیں دلی پیار دے پائے گی، جن کے وہ فطری حق دار ہوں گے۔ میں اکثر ماں کی ممتا، اس کا بھولپن اور اس کی روایتی سوچ پر ہنس دیا کرتا تھا۔ لیکن بعض دفعہ اکیلے میں جب مَیں اس کے خدشات، مادرانہ جذبات اور دور اندیشی پر غور کرتا تو وہ مجھے وِدوان لگا کرتی۔ اَن پڑھ ہو کر بھی مجھ سے زیادہ پڑھی لکھی محسوس ہوتی۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ یہ مادرانہ جبلت ہے جو میری اولاد، میرے مستقبل اور میرے تحفظ کی خواہش مند ہے۔ آخرش میں نے اس کی خواہش کا احترام تو کیا، مگر آدھا۔ مَیں نے شادی ایشیائی برادری میں ہی کی لیکن پردیس میں۔

پوجا، جس کا گھریلو نام پوجا ورما تھا اور جس کا خاندان یوگنڈا سے صدر امین کے دیس نکالے پر ہجرت کر کے لندن آن بسا تھا، وہ رجسٹرار کی موجودگی میں ایک ہی دستخط سے پوجا آہوجا بن گئی تھی۔ ہم زندگی کا نیا سفر شروع کرتے ہوئے خوش بھی تھے اور محتاط بھی۔ میرے فلیٹ میں قدم

رکھتے ہی اس نے گھر کی فضا بدل ڈالی تھی ۔ ہر گوشے میں بکھرا فرنیچر، کچن کا سامان اور آرائشی ٹکڑے اکثر مجھے شرمایا کرتے تھے کہ میں نے کنوارے پن میں ان کی کوئی قدر نہ کی تھی، لیکن پوجا کے آتے ہی ان کی قسمت جاگ اُٹھی ہے۔ بات بھی صحیح تھی کہ قدرت صفائی ستھرائی اور نفاست کے معاملے میں صنفِ نازک پر ازل سے مہربان رہی ہے۔ عورت ذات کے ہاتھ لگتے ہی گھر کی ہر شے نکھر جاتی ہے۔ مَیں خوش تھا کہ میری زندگی کے معنی ہی بدل کر رہ گئے تھے۔ ہر پل مجھے یہ احساس رہنے لگا تھا کہ اس بھری پُری دنیا میں کوئی دوسرا شخص بھی ہے جو میرے واسطے زندہ ہے۔ شام میں دفتر سے فارغ ہونے پر مجھے گھر پہنچنے کی اتنی جلدی ہوا کرتی تھی کہ میں موٹروے پر مقررہ رفتار سے بھی زیادہ تیز گاڑی چلایا کرتا۔ محض پوجا کی صحبت میں، اس کے ہاتھوں کی بنی ہوئی خوشبودار چائے پینے کی خاطر۔

گھر کی دہلیز کا ہر شخص کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اُسے پار کرتے ہی آدمی کی شخصیت بدل جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا کرتا۔ پوجا کا شاداب چہرہ دیکھتے ہی دن بھر کی تھکاوٹ چٹکیوں میں دور ہو جاتی۔ وہ مجھ سے پہلے کام سے لوٹ آتی تھی۔ ہم دونوں برسرِ روزگار تھے اور ہماری آمدنی بھی قریب قریب ایک سی تھی۔ چائے کے دوران ہم اکثر نجی معاملات، گھریلو مسائل، افزائش نسل اور مالی حالات سے متعلق تبادلہ خیالات کیا کرتے۔ جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو باہمی صلاح ومشورے سے کوئی نہ کوئی حل تلاش کر لیتے۔ لیکن زیادہ تر حل تلاش کرنے میں اُسی کا ہاتھ ہوا کرتا۔ میں اُس کی ذہانت پر رشک کیے بنا نہ رہ پاتا۔ وجہ میں جانتا تھا کہ اُس نے ابتدائی تعلیم پبلک اسکول میں پائی تھی، پھر یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کرنے پر بینک میں اچھا عہدہ بھی پایا تھا۔ وہ دیش کے مرکزی دھارے کا گہرا شعور رکھتی تھی اور معاشرے کا ہر پہلو، ہر تضاد مجھ سے کہیں بہتر سمجھتی تھی۔

ہمارا دوستانہ حلقہ، جو میرے اور پوجا کے چند گنے چنے شادی شدہ جوڑوں پر مشتمل تھا، ان کی نظر میں ہماری حیثیت ایک مثالی جوڑے کی تھی۔ وہ سب پوجا کی سوچ، رویے، خیالات اور حسن سے مرعوب تھے اور مجھے خوش قسمت قرار دیا کرتے۔ میں بھی پوجا کو پا کر خود پر نازاں تھا۔

لیکن اس کی شخصیت کا ایک پہلو ایسا بھی تھا جو میرے نزدیک خاصا تکلیف دہ تھا۔ وہ ہر معاملے میں ذاتی مفاد کا دامن ہرگز نہ چھوڑا کرتی۔ اسی شخص کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا پسند کرتی، جہاں اُسے اپنا فائدہ دِکھائی دیتا۔ اس کی کوشش یہی رہا کرتی کہ وہ دوسروں کے سر پر مزے لوٹتی پھرے۔ روپے پیسے کے معاملے میں وہ اتنی محتاط تھی کہ اپنے حصے کے علاوہ ایک پینس زائد خرچ کرنا اپنے کردار کے خلاف سمجھتی تھی۔ اس کا احساس مجھے شادی سے پہلے کچھ کچھ ہو گیا تھا۔ ان دنوں ہماری کورٹ شپ چل رہی تھی اور ہم رفتہ رفتہ نزدیک آ رہے تھے۔ ایک شام ہم دریائے تھیمز کے کنارے رچمنڈ کی ایک پب میں بیٹھے تھے۔ شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ مالی بندوبست زیرِ گفتگو تھا۔ بولی:

''گھر میں چلاؤں گی۔ ہر ہفتے شاپنگ پر جو بھی خرچہ ہو گا ہم آدھا آدھا بانٹ لیا کریں گے۔''

''لیکن فلیٹ کا کرایہ، کونسل ٹیکس، بجلی، گیس، پانی اور فون کے بل؟''

''وہ بھی ہم آدھا آدھا ادا کریں گے۔''

''تمھاری پیشکش بڑی معقول ہے اور عملی بھی ...... لیکن میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا؟''

اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن کر رہ گیا۔ سوچتی ہوئی نظروں سے مجھ کو تکتی رہی، تکتی رہی۔ مَیں نے اس کا کومل ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ''سنو پوجا، چند دنوں میں تم میری جیون ساتھی بن جاؤ گی... شادی کے بعد جو بھی میرے پاس ہو گا وہ صرف میرا ہی نہیں تمھارا بھی ہو گا۔ تم بھی اگر اس طرح سوچو تو ٹھیک رہے گا؟''

مگر وہ اپنے موقف سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس نے اپنا نقطہ نظر برقرار رکھا۔

''یہ تبھی ممکن ہے جب ہمیں ایک دوسرے پر مکمل بھروسا ہو اور یہ بھروسا شادی کے کامیاب ہونے پر ہی پیدا ہوتا ہے۔''

میں نے بات کو آگے بڑھانا مناسب نہ سمجھا کہ اس کی پرورش ایک ایسے ماحول، ایک ایسے ملک میں ہوئی تھی، جہاں کا ہر شخص خود کو مکمل آزاد یونٹ تصور کرتا ہے۔ وہ محض اپنے لیے زندہ ہے۔ اپنے ہی بارے میں سوچتا ہے۔ دوسرے کی زندگی میں دلچسپی لینا یا دخل دینا روایت کے خلاف

سمجھتا ہے۔ لیکن میری سائیکی میں یہ تلخ سچ بھی بیٹھ چکا تھا کہ پوجا کے رویوں میں تبدیلی لانا لازم ہے کہ اسی میں ہم دونوں کی بہتری پوشیدہ ہے اور ہماری کامیاب شادی بھی۔

جیون کے نئے سفر میں ''وقت'' ایک مہربان دوست کی طرح ہمارے درمیان تال میل پیدا کرتا بڑھتا رہا۔ ہمارے ساتھ ہمارا رب بھی خوش تھا۔ لیکن ہمارا مالی بندوبست وہی تھا جو شادی سے پہلے طے پایا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے پوجا خرچے کا پورا حساب کتاب کر کے مجھے نصف رقم ادا کرنے کو کہتی تو مجھے سخت کوفت ہوتی۔ لگتا کہ وہ میری بیوی نہیں ہے بلکہ ایک ایسی عورت ہے جو میرے ساتھ گھریلو کاروبار میں شریک ہے اور ہم کاروبار کو بلا کسی روک ٹوک کے چلائے جا رہے ہیں۔ یہ خیال بھی پریشان کرتا کہ یہ برابر کی ادائیگی، برابر کی حصے داری؟ آخر یہ سب کیا ہے؟ ہم ایک دوسرے کا بدن تو خوشی خوشی بانٹ کر لطف اندوز ہوتے ہیں اور اسے چومتے چاٹتے تھک بھی جاتے ہیں۔ مگر روپوں پیسوں کے معاملے میں یوں اجنبی بن جاتے ہیں، گویا ہمارا سرے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو؟ میرے ساتھ مصیبت یہ تھی کہ جس دھرتی سے میرا خمیر اُٹھا تھا، اس کی بوباس میرے اندر موجود تھی۔ جن روایات کے سہارے میرا بچپن اور جوانی گزری تھی، وہ بھی الگ تھیں۔ میں ان کے مطابق جینے کا عادی تھا اور جینا چاہتا تھا۔ لہٰذا ایک روز میں نے دل کڑا کر کے فیصلہ کیا کہ ''تیرا میرا'' تصور کے تمام تقاضے پورا کرتا ہوا میں اپنے ہی ڈھنگ سے جیؤں گا۔ خواہ وہ پوجا کو اچھا لگے یا بُرا؟

مَیں دفتر سے لنچ ٹائم کے دوران کبھی کبھار گھومتا پھرتا شاپنگ آرکیڈ میں چلا جاتا۔ وہاں کوئی شے میرے دل کو بھا جاتی تو مَیں اُسے عادتاً اور فطرتاً خرید کر گھر لے آتا۔ نئی شے کو دیکھ کر پوجا کا چہرہ گلنار ہو جاتا۔ وہ میرے ذوقِ انتخاب کی کھل کر داد دیتی۔ لیکن کچھ دیر میں جب میں اسے شے کے دام بتاتا تو وہ ایک لمبی خاموشی اختیار کیے گھر کے کسی گوشے میں غائب ہو جاتی۔ غالباً اُسے دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں اسے نایاب شے کی آدھی رقم ادا نہ کرنی پڑے؟ تقریباً ہر ویک اینڈ پر کسی انڈین یا چائنیز ریسٹورنٹ میں ڈِنر کرنا ہمارا معمول بن چکا تھا۔ کبھی کبھی ہم انڈین یا کوئی انگلش فلم بھی دیکھ لیا کرتے۔ لیکن ریسٹورنٹ اور فلم کا پورا خرچہ میں ہی مسکرا کر برداشت کرتا تھا۔

گھر کے بعض چھوٹے موٹے بل مَیں خود ہی چکا دیا کرتا تھا اور پوجا سے آدھی رقم طلب نہ کرتا تھا۔ لیکن وہ معمولی عورت نہ تھی۔ بامعنی نظروں سے مجھے تکتی رہتی۔ جانتی تھی کہ میں دانستاً شاہ خرچ بنا اس کے گرد جال بُنتا جا رہا ہوں اور اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر اُلجھانا چاہتا ہوں۔ لہٰذا ایک دن اس نے شکایتاً کہا:

''تم کو پیسے کی کوئی قدر نہیں؟''

''مجھے؟'' میں صریحاً انجان بن گیا۔

''ہاں تمھیں.... تم جانتے ہو اِن ملکوں میں پیسا کمانا کتنا مشکل کام ہے۔ یہاں لوگ باگ پیسے کو کتنا اہم سمجھتے ہیں۔ پر تم جو کماتے ہو، خرچ کر ڈالتے ہو؟''

''تو کیا ہوا میں خرچہ کسی غیر پر تو نہیں کرتا۔''

''پر تم کو آگے کی بھی سوچنا چاہیے۔''

''ڈارلنگ آنے والا وقت کس نے دیکھا ہے، جو میں اس کی فکر کروں۔''

''پر میں نہیں چاہتی، تم اپنی ساری کمائی مجھ پر اور گھر پر لٹاتے پھرو؟''

اُس کی ناراضگی بڑھتی جا رہی تھی۔ مَیں اُسے کچھ پریشان، کچھ فکرمند پا کر خوش بھی تھا کہ اس نے میرے متعلق سوچنا شروع کر دیا ہے۔ مَیں نے آگے بڑھ کر اُسے بازوؤں میں لے لیا۔

''پوجا، مجھے گھر کی خوشی بڑی عزیز ہے.....اور سچ پوچھو تو میرے نزدیک گھر کی خوشی پہلے آتی ہے، پیسا بعد میں۔''

عجیب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میری بات میں کہاں تک صداقت ہے۔ لیکن جب میں نے سچے من سے ہاں میں گردن ہلا کر اپنی ایمانداری کا ثبوت دیا تو وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ پھر جانے اس کے من میں کیا آیا کہ اس نے مجھے اتنے زور سے بھینچا کہ میرا روم روم بیدار ہو کر احساس دلانے لگا کہ ہم دو نہیں ایک ہیں۔ اس رات ہماری آتماؤں نے سرگوشیاں کی تھیں۔ صحیح معنوں میں وہ رات ہماری ہنی مون کی رات تھی۔

دُھند کے چھٹتے ہی زمین دور دور تک سرسبز دکھائی دینے لگی تھی۔ میری فراخ دلی، شاہ

خرچی اور طرزِ زندگی نے اس پر ایسا جادو کیا تھا کہ وہ میرے اُٹھائے ہوئے ہر قدم پر پگھلنے لگی تھی اور عورت جب کسی مرد کی خاطر پگھلتی ہے تو وہ اُس کی نظر سے دنیا کو دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ پوجا بھی اس سطح پر سانس بھرنے لگی تھی اور میں بے پناہ خوش تھا۔ ہمارے درمیان سے جذباتی فاصلے، بے اعتباری اور اجنبیت دور ہوگئی تھی۔ لیکن مالی دیواریں جوں کی توں کھڑی تھیں۔ اُنھیں گرانا یا پھلانگنا شاید اُسے منظور نہ تھا۔ ''تیرے میرے'' کا تصور جوں کا توں قائم تھا۔ اور ایک روز تو انتہا ہوگئی۔ بات معمولی تھی۔ لیکن کبھی کبھار معمولی بات بھی غیر معمولی بن کر دلوں کے درمیان آن کھڑی ہوتی ہے اور آدمی محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ جہاں سے روانہ ہوا تھا، وہیں واپس لوٹ آیا ہے۔ میں لاؤنج میں بیٹھا ٹیلی وژن دیکھ رہا تھا۔ پروگرام افریقہ کی Wild life کے متعلق تھا۔ میں ماہر جانوریات ڈیوڈ ایٹن برا کے تخیل اور اس کی شکاری آنکھ کا دلدادہ ہو گیا تھا۔ پروگرام اس قدر دلچسپ اور حیرت انگیز تھا کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کب پوجا کچن سے فارغ ہو کر میرے پاس آن بیٹھی ہے۔ اسے اپنے قریب بیٹھا ہوا پا کر مجھے اچنبھا بھی ہوا۔ مگر وہ ڈاکومینٹری میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کر رہی تھی۔ بلکہ اس کی اکتاہٹ حد سے بڑھ کر جب اس کے اعصاب پر سوار ہونے لگی تو اس نے غضبناک نظروں سے مجھے دیکھ کر یقین دلایا کہ وہ شکاریات یا جانوروں کی دنیا میں دلچسپی نہیں رکھتی۔ لیکن وائلڈ لائف کا پروگرام جاری تھا۔ اس نے چپکے سے روموٹ کنٹرول اُٹھایا اور بٹن دبا کر چینل بدل ڈالا۔ اگلا پل بھی نہ گزرا تھا کہ میں افریقہ کے جنگلوں سے لندن لوٹ آیا۔ میرا ذہنی سوئچ آف ہو گیا تھا۔ وہ اپنی صفائی میں یک لخت بول اُٹھی:

''تم ہمیشہ اُلٹے سیدھے پروگرام دیکھا کرتے ہو.........اور بھول جاتے ہو کہ اس گھر میں کوئی دوسرا بھی رہتا ہے؟''

اُسے اُکھڑا ہوا پا کر میں نے مجبوراً کہا: ''شاید تم سوچتی ہو، میں خود غرض ہوں ....لیکن ایسا نہیں ہے۔ مجھے سدا تمھاری موجودگی کا احساس رہا ہے۔''

''پھر تم وہ پروگرام کیوں نہیں لگاتے جن کو میں بھی پسند کرتی ہوں؟''

''ضروری نہیں کہ تمھاری پسند میری پسند بھی ہو؟''

''اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے ....لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ یہ ٹیلی وژن صرف تمھارا نہیں، میرا بھی ہے۔میں نے بھی برابر کی رقم ادا کی تھی۔''
یکبارگی ''تیرے میرے'' کا سلسلہ ابھر آیا تھا۔جس سے میں اکثر پہلو بچانے کی کوشش کرتا تھا۔ لٰہذا میں نے بات کو ٹالنا چاہا:''ایسا کرتے ہیں اس ٹیلی وژن کو دو حصوں میں بانٹ لیتے ہیں۔ ایک حصہ تم رکھلو، دوسرا میں، پھر اپنی اپنی پسند کا پروگرام دیکھا کریں گے؟''
''تم کو مذاق سوجھ رہا ہے اور میں بالکل سنجیدہ ہوں۔''
اس کو لال پیلی دیکھ کر میں بھی کچھ کچھ سنجیدہ ہو گیا تھا۔لیکن میں نے یہ کہہ کر سارا معاملہ رفع دفع کرنا چاہا:
بات چھوٹی سی تھی ......اگر تم نے مجھ کہا ہوتا یا ہلکا سا اشارہ بھی کیا ہوتا تو میں خود ہی پروگرام بدل دیتا۔''
''کیا.....؟ میں تم سے کہتی.....؟
اس کے لہجے کی تندی، حیرانی اور بدلتے تیور سے واضح تھا کہ اسے میرا رویہ قطعاً پسند نہیں آیا۔ بلکہ میرا ادا کردہ جملہ اس کی انا کو اتنی شدت سے چھو گیا ہے کہ وہ اندر ہی اندر تڑپ اُٹھی ہے اور اب جلد طوفان آنے والا ہے۔....واقعی وہ شیرنی کی طرح بھپر اُٹھی تھی۔
''تم میرے شوہر ضرور ہو لیکن میرے مالک نہیں کہ میں ہر بات تم سے کہتی پھروں .....میری اپنی بھی کوئی حیثیت ہے یا نہیں؟''
''اس سے کون انکار کرتا ہے؟''
''تو پھر تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تم سے پروگرام بدلنے کو کہوں گی؟ ....تم کو خود احساس کیوں نہیں ہوتا کہ اس گھر میں کوئی دوسرا بھی رہتا ہے؟''
خاموش رہ کر میں نے ایک چپ سو سُکھ کی ترکیب استعمال کرنی چاہی۔لیکن طوفان کو تو بہر حال آنا تھا، آیا اور بربادی کے آثار چھوڑ کر چلا گیا۔
''کیوں بھولتے ہو کہ اس گھر کی ہر چیز پر میرا برابر کا حق ہے ......میں برابر کا خرچہ ادا کرتی ہوں

اور میں کسی بھی طرح تم سے کم نہیں؟''
''میں جانتا ہوں .....اور یہ بھی جانتا ہوں یہ خوبصورت گھر جسے ہم نے مل کر بنایا ہے، ہمارا ہے اور ہم دو نہیں ایک ہیں ...... ایک۔''
''یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔اگر کل ہم میں سے ایک خرچہ دینا بند کردے تو جانتے ہو انجام کیا ہوگا؟''
خاموش رہنا ہی میرے لیے مناسب تھا۔
''نہ تو یہ گھر چلے گا اور نہ ہی زندگی کی گاڑی آگے بڑھے گی۔''
یکبارگی مجھے احساس ہوا کہ جن دیواروں کو پوجا گرا کر میرے نزدیک آئی تھی، وہ پھر سے کھڑی ہوگئی ہیں۔ان کا قد پہلے سے بھی اونچا ہوگیا ہے اور میں کوشش کے باوجود انھیں گرانے میں ناکام رہا ہوں۔ایک بھیانک خیال خوف کی صورت میرے ذہن میں اُبھرا اور میں نے فوراً اس کی تصدیق کرنا چاہی:
''فرض کرو کل میں بیمار پڑ جاتا ہوں .... یا یوں سمجھو کہ میری نوکری چھوٹ جاتی ہے اور میں گھر کا خرچہ دینے کے قابل نہیں رہتا۔اس صورت میں تم کیا کروگی؟''
میرے سوال نے اُسے اُلٹا ضرور کھڑا کر ڈالا تھا۔لیکن وہ معمولی ذہن نہیں رکھتی تھی۔ جانتی تھی کہ اُسے کیا جواب دینا ہے۔ گہری نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی گویا ہوئی:
''میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ ہماری زندگی تلخ ہوکر رہ جائے گی۔ کیوں کہ یہاں پیسا ہے تو زندگی ہے، ورنہ آدمی اپنی قدر کھو بیٹھتا ہے۔''
یہ کہہ کر وہ کھڑی ہوگئی اور کھٹاک سے چینل بدل کر کچن میں چلی گئی۔ وائلڈ لائف کا پروگرام پھر سے شروع ہوگیا۔میری آنکھیں دوڑتے بھاگتے، اُچھلتے کودتے جانوروں کو ضرور دیکھ رہی تھیں لیکن میرا ذہن تو کہیں اور ہی کھو چکا تھا کہ شادی بیاہ تو آتماؤں کا سنگم ہوتا ہے۔ پیسا تو آنی جانی شے ہے۔مگر وقت کے کروٹ لینے پر وہ اتنی زبردست قوت بن چکا ہے کہ پیار، محبت، ایثار سب بے معنی ہوکر رہ گئے ہیں۔

ایک شام میں تھکا ماندہ گھر میں داخل ہوا میں نے پوجا کو بے پناہ خوش پایا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی بے صبری سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے وہ ایک الگ ہی عورت نظر آئی۔ اس کی خوش وضع گردن بھی چھت کو چھو رہی تھی۔ لگا کہ اس نے کائنات کو فتح کر کے اپنے وینٹی بیگ میں ڈال رکھا ہے۔ چھوٹتے ہی بولی:

''آج چائے کو بھول جاؤ..... شاور لے کر فٹا فٹ تیار ہو جاؤ۔ ایک خوش خبری ہے، ریسٹورنٹ میں چل کر سناؤں گی۔''

میں دم بخود اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

''گھبراؤ مت.... آج میں تم کو ٹریٹ (Treat) کروں گی؟''

اس کے رویے میں نا قابل یقین تبدیلی پا کر میں اس قدر محتاط ہو گیا کہ میری سمجھ سے باہر تھا کہ میں اس کی پیشکش کو قبول کروں یا ٹھکرا دوں۔ لیکن گھریلو زندگی ایک نیا موڑ لیتے ہوئے محسوس ہو رہی تھی۔ جہاں رفاقت تھی، قربت تھی، روشنی تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ میں شادی کے روزِ اول سے ان سب کے واسطے تڑپ رہا تھا۔

انڈین ریسٹورنٹ کے بنگلہ دیشی ویٹر نے ہماری مانگ کے مطابق جو ٹیبل ہمیں پیش کی وہ گوشہ واقعی خاموش اور پُر سکون تھا۔ وہاں ایک مغل پینٹنگ بھی آویزاں تھی، جہاں اکبر بادشاہ اپنے نورتنوں سے مخاطب تھا اور وہ تمام اس کی طرف متوجہ تھے۔ پوجا نے وائن اور کھانے کا آرڈر دے کر وینٹی بیگ سے ایک خط نکالا اور میری طرف بڑھا کر کہا:

''لو پڑھو اسے۔ اچھی خبر بھی اس میں موجود ہے۔''

خط اس کی ملازمت سے تعلق رکھتا تھا۔ بینک کے بورڈ آف ڈائرکٹرز نے اس کی قابلیت کو سراہتے ہوئے اُسے اونچے عہدے پر مامور کیا تھا اور اس کی تنخواہ میں بھی اچھا خاصا اضافہ کر دیا تھا۔ لیکن اس شرط پر کہ اس کا تبادلہ لندن شہر سے مانچسٹر میں ہو گا اور سات دنوں میں اسے ہاں یا نا میں اپنا فیصلہ دینا ہو گا۔ میں نے خط کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھا۔ پھر پوجا سے آنکھ ملائے بغیر خط کو تہوں میں ملفوف کر کے میز کے درمیان میں رکھ چھوڑا۔ پھر اس کے آر پار دیکھنے کی کوشش کی:

''کیا فیصلہ کیا تم نے؟''
''یہ تو بعد میں بتاؤں گی۔ مگر تمھارا چہرہ کہہ رہا ہے کہ خط پڑھ کر تم خوش نہیں ہوئے؟''
میں گردن گھما کر بادشاہ اکبر اور اس کے نورتنوں کو دیکھنے لگا۔
''جانے کیوں دنیا کا ہر مرد برداشت نہیں کر پاتا کہ اس کی بیوی نے بڑا رتبہ حاصل کر لیا ہے اور چار پیسے بھی زیادہ کمانے لگی ہے۔ وہ تو یہی چاہتا ہے کہ اس کی بیوی عمر بھر اس کے انگوٹھے تلے رہے۔''
ایسا مت کہو۔'' میں قدرے اُکھڑ گیا۔ مگر اُسے سمجھاتے ہوئے بولا:
''عورت ذات کے متعلق تم میرے خیالات جانتی ہو۔ میں نے ہمیشہ اسے برابر کا درجہ دیا ہے۔ کئی معاملوں میں وہ مرد سے بھی آگے ہے۔ جیون دُکھ درد جو وہ سہتی ہے، مرد نہیں سہہ سکتا۔''
''تو پھر میری ترقی جان کر تم خوش کیوں نہیں ہوئے؟''
''مجھے خوشی ہوئی ہے اور نہیں بھی؟''
ویٹر سُرخ وائن کی بوتل لے کر چلا آیا تھا اور ساتھ میں شامی کباب کی پلیٹ بھی۔ وہ ہمارے گلاس قریب قریب بھر کر چلا گیا۔ پوجا بے چینی سے لفافے کو اُلٹنے پلٹنے لگی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر ہچکچا رہی تھی۔ دیر تک اس کی انگلیاں لفافے سے کھیلتی رہیں۔ پھر سر اُٹھائے بنا ہی بول اُٹھی:
ایسا موقع شاید ہی میری زندگی میں پھر آئے۔ عہدہ بھی اچھا ہے اور پیسے بھی .... کیا خیال ہے تمھارا؟''
''فیصلہ تمھیں کرنا ہے، مجھے نہیں۔ مَیں تو صرف مشورہ دے سکتا ہوں؟''
''لیکن مجھے تمہارے مشورے کے ساتھ تمہارا فیصلہ بھی چاہیے۔''
مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ لہٰذا میں نے بے باک ہو کر کہا: ''میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر تم مانچسٹر چلی گئیں تو میں لندن میں بالکل اکیلا ہو جاؤں گا۔''
اس نے کرسی آگے کو کھسکائی اور میرا ہاتھ تھام لیا۔
''میں ہر ویک اینڈ لندن میں تمہارے ساتھ گزارا کروں گی۔ یہ میرا وعدہ رہا۔''
جس ڈھنگ سے اس نے اپنا دل اُگلا تھا، اس میں سچ ہی سچ تھا اور سچ بھی ایسا جو دوسرے

کو یقین دلانے میں پیش پیش ہو۔

''مانچسٹر کون سا دور ہے۔ ذرا سوچو تو۔صرف دو گھنٹوں کا تو راستہ ہے۔ پھر تمہارا دل جب چاہے تم میرے پاس آسکتے ہو۔''

میری روح کی گہرائیوں تک یہ احساس اُتر چکا تھا کہ اس نے خود کو ذہنی طور پر تبادلے کے واسطے تیار کر رکھا ہے اور اب ہمارے جیون مختلف دھاروں پر بہہ کر الگ الگ سمتوں میں سفر کریں گے۔ ہم میاں بیوی ضرور رہیں گے۔ لیکن شہروں کے فاصلے، ایک دوسرے کی عدم موجودگی، شخصی آزادی اور خود مختاری ہمیں روز بروز دور کرتی چلی جائے گی اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ ہم بس نام کے ہی میاں بیوی قرار دیے جائیں گے۔

''پوجا یہ معاملہ بڑا اُلجھا ہوا ہے۔ ہماری زندگیاں بھی اُلجھ کر رہ جائیں گی؟''

''اگر ہم ہر پہلو، ہر نکتہ سوچ سمجھ کر طے کرلیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری زندگی پر کوئی حرف بھی آئے یا کوئی غلط فہمی پیدا ہو؟''

''جلد بازی مت کرو۔ ابھی وقت ہے۔ مجھے بھی سوچنے دو۔''

''ٹھیک ہے۔۔لیکن یاد رہے کہ میرے انکار کرنے پر مجھے اس عہدے سے ہمیشہ محروم رکھا جائے گا۔''

'کیوں؟''

اس وقت ہمارے بینک میں کوئی سفید آدمی ایسا موجود نہیں ہے جسے یہ عہدہ پیش کیا جا سکے۔''

نو آبادیات کی دین نسلی امتیاز اور رنگوں کے بھید بھاؤ میں میرا ذہن اُلجھ کر رہ گیا اور مجھے پوجا سے ہمدردی ہونے لگی۔

میری زندگی ایسے مقام پر آن کھڑی ہوئی تھی، جہاں ہر گزرتا پل یہ احساس دلا کر گزر رہا تھا کہ جس زمین پر میں کھڑا ہوں، وہاں پھسلن ہی پھسلن ہے۔ یہ خیال ہی میرے نزدیک دیمک سے کم نہ تھا کہ پوجا کا تبادلہ ہماری ازدواجی زندگی کو رفتہ رفتہ ختم کر ڈالے گا اور میرے شریر کا وہ انگ، جس کی مدد سے میں سانس لے رہا ہوں، وہ بجھ کر خاک ہو جائے گا۔ دوسری طرف پوجا کی

ترقی تھی، مستقبل تھا، دلی خواہش تھی۔ اگر انہیں سراہا نہ گیا اور نہ ہی احترام کیا گیا تو وہ یقینی طور پر مجھے خودغرض، کم ظرف اور کمینہ ٹھہرائے گی۔ عمر بھر طعنوں سے نوازا کرے گی۔ سوچ سوچ کر میرے بالوں کی جڑیں سفید ہو رہی تھیں اور میں جوانی میں ہی بوڑھا بنا اس سچائی میں گم تھا کہ سماجی حیثیت، رُتبہ اور پیسہ اس قدر اہم ہو گئے ہیں کہ ان کو پانے کی خاطر آدمی رشتے ناطے بھی توڑنے سے گریز نہیں کرتا۔

آخر وہ دن بھی آ گیا، جب مجھ کو اپنا فیصلہ سنانا تھا۔ اس سمے میں نے خود کو رن بھومی میں کھڑا پایا۔ اپنی پوری ہمت کو یکجا کر کے بولا: ''پوجا۔ میں تمہیں مانچسٹر جانے سے روک نہیں سکتا۔۔۔ لیکن یہ کہنے کا حق ضرور رکھتا ہوں کہ تمہارے چلے جانے سے گھر کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

یہ سننا تھا کہ اس کا چہرہ اپنا رنگ یوں کھو بیٹھا، گویا میں اسے زندہ دفن کرنے والا ہوں۔ آخر سنبھل کر بول اُٹھی: ''یوں کہو کہ تم اپنی غرض اور اپنے سکھ کے واسطے مجھ کو روکنا چاہتے ہو؟''

''میرے سکھ میں تمہارا سکھ بھی شامل ہے۔۔۔ ہمارا مستقبل بھی اس میں شامل ہے۔ ورنہ ہمیں جذباتی نقصان اُٹھانا پڑے گا۔''

''ایسا تم سوچ رہے ہو، میں نہیں۔۔۔ اس دیش میں ہزاروں جوڑے ایسے ہیں، جہاں شوہر اپنے کام کی وجہ سے ایک شہر میں رہتا ہے تو بیوی دوسرے شہر میں۔ لیکن ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ وہ ہر اعتبار سے خوش ہیں۔''

''مگر بیوی کا مقام اس کے شوہر کے ساتھ اس کا گھر ہوتا ہے۔۔۔ دوسرا شہر نہیں۔''

میرا اکڑ واسچ اس سے برداشت نہ ہوا۔ ٹپٹا اُٹھی: ''تمہاری روائیتی سوچ نے ہمیشہ تم کو زمانے کی رفتار سے پیچھے رکھا ہے۔ یہ تمہاری ٹریجڈی ہے۔''

''اور تمہاری ٹریجڈی جو شروع ہونے والی ہے، اس کا تمہیں کوئی احساس نہیں؟''

''میں بے وقوف نہیں ہوں۔ سوچ سمجھ کر قدم اُٹھا رہی ہوں۔۔۔ میری بہتری اسی میں ہے کہ یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دوں۔''

''چاہے تمہاری شادی شدہ زندگی ختم ہو جائے؟''

''اگر تم نے اس حد تک سوچ لیا ہے، تو ٹھیک ہے۔۔۔تم مجھے طلاق کیوں نہیں دے دیتے؟''

''یہ کام تم بھی تو کر سکتی ہو؟''

میرے جواب کی بھرپور تلخی، تیزی اور اس کی کاٹ کو وہ برداشت نہ کر پائی تھی۔ پاؤں پٹک کر فوراً اٹھی، غضبناک نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ لگا کہ وہ مجھ پر حملہ کرنے کو جا رہی ہے۔ مگر اپنے کمرے میں جا کر اس نے اتنے زور سے دروازہ بند کیا کہ دھماکا ہوتے ہی میرے کان سن ہو کر رہ گئے۔

اور اب میں کمرے میں اکیلا بیٹھا گہری سوچ میں ڈوبا ہوں کہ بات کہاں سے نکل کر کہاں تک پہنچ گئی ہے اور کون جانے کہاں جا کر ختم ہو۔

☆☆

تعلق

صدیوں بعد اس کو دیکھا تھا۔ وہ دریائے تھیمز کے کنارے ساؤتھ بینک کی ایک بینچ پر اکیلی بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مگر اس میں یوں کھوئی ہوئی تھی کہ اسے آس پاس کا کوئی ہوش ہی نہ تھا۔ وہی تنی ہوئی لمبی گردن، وہی پھیلے ہوئے ابرو اور وہی گھنے بال۔ گویا کسی پرندے نے اس کے سر پر گھونسلہ بنا رکھا ہو، مگر اب اُس گھونسلے میں کالے سے زیادہ سفید تنکے آچکے تھے۔ وقت اپنے کئی سال مکمل کر کے میرے اور اس کے چہرے پر اپنے کئی نقش چھوڑ گیا تھا۔ ابابیلوں کا جھنڈ دریا سے گزرتا، بگ بین (BIGBEN) کی سمت بڑھ رہا تھا۔ آکاش صاف تھا۔ شام اتر رہی تھی اور فضا خوشگوار تھی۔ میں ریلنگ پر جھکا ہوا بہتے دریا کو دیکھ رہا تھا، جو دھیرے دھیرے بہہ کر میرا ذہن بھی اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا اور میں نارتھ فیلٹ علاقے کی پیٹر روڈ کے مکان نمبر ۱ے میں پہونچ گیا۔ دو منزلہ پرانا وکٹورین مکان تھا۔ اونچا ہوادار اور کشادہ۔ کرائے داروں سے اٹا ہوا۔ وہ سب کے سب ایشیائی نژاد تھے اور مجرد بھی۔ زندگی سے دست و گریباں ہو کر، گھر بار سے ہزاروں میل دور پردیس میں بہتر مستقبل اور معاشی تحفظ کی خاطر جدوجہد کر رہے تھے۔ میں ان

دنوں ایک بسکٹ فیکٹری میں ملازم تھا۔کام راتوں کا تھا۔دس گھنٹوں کی شفٹ نپٹا کر جب میں فیکٹری کے احاطے سے باہر قدم رکھتا تو لگتا کہ مجھے دوسرا جیون مل گیا ہے اور میں رات بھر صلیب پر لٹکا رہا ہوں۔میری آنکھوں کے نیچے ہلکے ہلکے سیاہی مائل حلقے بھی ابھر آئے تھے، جو رفتہ رفتہ گہرے ہو رہے تھے۔لیکن مجھے کام کے ساتھ پیسوں کی بھی اشد ضرورت تھی کہ میں اپنے ایک عزیز ترین دوست کی رقم لوٹانا چاہتا تھا۔اس نے میری انگلستان کی ٹکٹ خریدنے میں ایک سود خور پٹھان سے قرض لے کر بروقت میری مدد کی تھی۔

یہ دوسرے جیون اور صلیب کا سلسلہ برابر ڈیڑھ برس تک چلتا رہا۔میں بلاناغہ مرتا بھی رہا جیتا بھی رہا اور صلیب پر بھی لٹکتا رہا۔مگر ایک بات میری سوچ اور میرے اندرونی نظام میں صاف ہو چکی تھی کہ انگریز سرمایہ دار مزدوری کے لیے اگر معقول اجرت ادا کرتا بھی ہے تو اس کے عوض وہ مزدور کے لہو کے ساتھ اس کی عمر کے کئی سال بھی ہڑپ کر لیتا ہے۔اگر مزدور سمجھدار ہو اور اس کے چنگل سے آزاد نہ ہو پائے تو وہ اسی دائرے میں رہ کر ایک ہی لکیر کو پیٹتا رہتا ہے۔

سترہ نمبر مکان ایک پاکستانی شہری کی ملکیت میں تھا۔مالک مکان خود بھی ایک طرح سے مجرد ہو چکا تھا۔وہ موٹروں کی معروف کمپنی فورڈ کی مارننگ شفٹ میں کام کیا کرتا تھا، جو صبح سات بجے سے شروع ہو کر تیسرے پہر کے وسط میں کہیں ختم ہوتی تھی۔پھر وہ شخص گھر پہونچ کر کرائے داروں کے لوٹنے تک لمبی تان کر سویا کرتا تھا۔اس کے کرائے دار زیادہ تر مسلم ہی تھے۔میں کمرہ دیکھنے جب مقررہ وقت پر اس کے ہاں پہونچا تو وہ میرا ایشیائی رنگ روپ اور حلیہ دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا لیکن بات چیت کے دوران جب اسے یہ علم ہوا کہ میرا تعلق انڈیا سے ہے، میری پیدائش پشاور کی ضرور ہے، لیکن میں ایک ہندو سکھ خاندان سے ہوں اور تقسیم کے دوران اپنے والدین کے ساتھ دہلی ہجرت کر گیا تھا تو وہ اُدھیڑ بن میں ڈوب گیا کہ اسے خالی کمرے کے متعلق کیا فیصلہ کرنا ہے؟ میرے دائیں ہاتھ کی کلائی میں جھولتا ہوا مذہبی کڑا دیکھ کر اس کے ماتھے کی لکیریں مزید گہری ہو گئی تھیں۔پھر جانے کس مثبت جذبے نے اپنا رنگ دکھایا کہ اس نے بڑھ کر گرمجوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔گوش گزار ہوا! ''یار سنگھ۔اس جناح اور نہرو کا بیڑا غرق ہو۔ہم سب کی دنیا برباد ہو گئی۔''

مجھے سیڑھوں (لینڈنگ) کی طرف لے جاتے ہوئے اس نے اپنی بات کو جاری رکھا۔ ''دیکھ نا۔ تو بھی وہی زبان بولتا ہے، جو میں بولتا ہوں۔ ہماری زبان ایک۔ لباس ایک۔ کھانا پینا ایک۔ صرف مذہب الگ تھا ناں؟''

''ہاں یہ تو ہے۔'' لاشعوری طور پر یہ الفاظ خود بخود میرے ہونٹوں سے ادا ہو گئے۔

''دیکھ نا۔ ہم سب لوگ ادھر ادھر ہو گئے اور دشمن بھی بن گئے۔۔۔ دو جنگیں لڑیں۔ مگر کیا ملا ہم کو؟ ۔۔۔ آدھا ملک غلیظ بنگالیوں کو بھٹو کی مہربانی سے قربان کرنا پڑ گیا۔''

میں اس تذبذب میں تھا کہ اس باتونی شخص کو کیا جواب دوں؟ اس کی گفتگو میں حصہ لوں یا خاموش ہی رہوں۔ مگر اس نے سیڑھی پر پاؤں رکھتے ہی اپنا بیان جاری رکھا: ''کمرہ تو خالی ہے۔ مگر اس کے بغلی کمرے میں ایک عورت رہتی ہے۔۔۔ سالی غضب کی چیز ہے۔ سنگھ! مت پوچھ۔'' پھر آنکھ دبا کر گویا ہوا: ''اس حور پری کے دروازے پر غلطی سے دستک مت دے بیٹھنا۔ ورنہ کھڑے کھڑے چاقو چل جائیں گے۔ اور پولیس کیس الگ سے بنے گا؟''

''مجھ کو کمرہ درکار ہے خان بہادر۔۔۔ میں راتوں میں کام کرتا ہوں اور صبح رج کر سوتا ہوں۔''

''یہ تو اور بھی اچھا ہے۔''

میرا جیون حسبِ معمول جنم مرن کے دنوں سے گزر رہا تھا کہ ایک صبح کام سے لوٹنے پر مکان کی سیڑھیاں طے کرتا ہوا میں پہلی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا کہ وہ گھنے بالوں اور لمبی گردن والی حور پری سیڑھیوں سے اُترتی دکھائی دی۔ میں پہلی بار اس کو دیکھ رہا تھا۔ اسکرٹ، بلاؤز اور ہلکے سبز رنگ کی جیکٹ پہنے ہوئے، وہ نیچے کو چلی آ رہی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں کسی سُپر مارکیٹ کا جھولا تھا، جو اس کی بدنی حرکات سے اوپر نیچے ہوا جا رہا تھا۔ ہم جب ایک ہی سیڑھی پر پہونچ کر روبرو آن کھڑے ہوئے تو وہ میرے ہاتھ میں اردو کا رسالہ ''بیسویں صدی'' دیکھ کر دم بھر کو رکی۔ میرے حلیے کا بھرپور جائزہ لیا اور اگلے پل وہ سیڑھیوں سے اتنی تیزی سے اتر گئی، گویا اس کے نزدیک میری کوئی وقعت، کوئی اوقات ہی نہ ہو۔ میرے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس سوچ کے ساتھ ابھر آئی کہ ڈیوٹی پر بندھے ٹکے وقت پر پہونچنا مغربی زندگی کی پہلی شرط ٹھہری ہے۔ اب تو

تارکینِ وطن بھی اس پر عمل پیرا ہیں کہ کام پر دیر سے حاضر ہونے پر کہیں اُن کو ملازمت سے برطرف نہ کر دیا جائے۔ یہ خوف مسلسل اُن کی سائیکی میں رینگتا رہتا ہے۔

اس حور پری کا نام سلمہ آرزو تھا۔ یہ لینڈ لارڈ نشاط خان نے مجھ سے کہا تھا۔ وہ بذاتِ خود اس حور پری میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کی باتوں سے یہی ظاہر ہوا کرتا تھا۔ اس نے دورانِ گفتگو یہ بھی انکشاف کیا تھا کہ اس عورت کی اپنے شوہر کے ساتھ ایک روز بھی نہ بن پائی لہذا اس کے شوہر نے عاجز آ کر اسے لات مار کر گھر سے نکال باہر کیا ہے۔۔۔ اب وہ یہاں میرے ایک دوست کی سفارش سے پڑی ہوئی ہے۔ ورنہ میں کسی عورت کو اپنے مکان میں کمرہ ہرگز نہیں دیا کرتا۔۔۔ مرد کے اندر شیطان رہتا ہے نا؟ خنزیر جانے کب مرد کو ورغلا دے؟ اور مجھ جیسے غریب کو کورٹ کچہری بھگتنی پڑے۔''

اس روز پہلی بار میں سنجیدگی سے خان سے مخاطب ہوا تھا۔

''آپ اس سے کوئی امید تو نہیں رکھتے؟''

''یار سنگھ۔ تم آدمی ٹھیک ٹھاک لگتے ہو۔ تم سے بات ہو سکتی ہے؟''

وہ ویک اینڈ کی پہلی شام تھی۔ پانچ راتوں کا جان لیوا کام میرے دماغ کا گودا بھی خشک کر ڈالا کرتا تھا۔ میں اکثر نشہ آور مشروب سے دل بہلا کر جسمانی تھکاوٹ اور ذہنی کوفت کو دور کیا کرتا تھا۔ اس شام میں خان کے گراؤنڈ فلور کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک طرح سے اس کا دفتر بھی تھا۔ وہاں اس کے کاغذات فائلیں اور ذاتی ٹیلی فون بھی دھرا تھا۔ ورنہ اس نے لاجروں کے واسطے برآمدے میں الگ سے فون باکس لگوا دیا تھا۔ بس سکے ڈالتے جاؤ اور فون کرتے جاؤ۔ کمرے کے ایک کونے میں رکھے بک کیس میں اردو کی چند کتابوں کے ساتھ چند فائلیں بھی موجود تھیں۔ ایک فائل پر اردو میں جلی حروف میں تحریر تھا ''انکم ٹیکس'' اس نے مکان خریدنے پر چار پانچ کرائے دار اپنی برادری اور اپنے مذہب کے گھر میں ڈال لیے تھے۔ مگر ان سے کرایہ وصول کرنے پر اس نے اپنی مزید آمدن کی اطلاع انکم ٹیکس والوں کو نہ دی تھی۔ لینڈ لارڈ بن کر وہ غرور سے اتنا چوڑا ہو گیا تھا کہ اگر کوئی لاجر وقت پر کرایہ ادا نہ کرتا تو وہ اسے اتنا ذلیل کرتا کہ کوئی کوئی لاجر رو دیتا۔ مگر ایک

لاجر نے ٹیکس والوں کو مختصر سا فون کر کے اپنا بدلہ چکا لیا تھا۔ چھاپہ پڑا۔ دو جعلی امیگرانٹ مفت میں مارے گئے اور ان بے چاروں کو بغیر کسی سنائی کے پاکستان ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ تب سے خان ہر لاجر کو رینٹ بک دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔

اس شام شراب کباب اور نمکیات میری طرف سے تھے۔ خان بڑی بے دردی سے ان پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ غور سے اسے دیکھنے پر اس کی داہنی آنکھ مجھ کو پتھر کی محسوس ہوئی۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ وہ مرغوں کی لڑائی میں چھڑاتے وقت قدرے متاثر ہوئی تھی۔ اس کے سر کے بال روز بروز پتلے ہو رہے تھے۔ صاف رنگ کے استخوانی چہرے پر ابھرتی مدھم لکیریں اس کی عمر کا احساس دلا رہی تھیں۔ وہ یقیناً مجھ سے دس سال بڑا تھا۔ میں ابھی بتیس کو پہونچا تھا۔ خان اپنے قومی لباس شلوار قمیض اور بلوچی واسکٹ پہنے مستی میں کھویا ہوا تھا۔ معاً بول اٹھا:

''یہ اُلو کی پٹھی ہے۔۔۔ مصیبت کی ماری یہاں پڑی ہے۔ کوئی آگے نہ پیچھے۔ گھر والے کراچی میں ہیں۔ واپس جائے تو وہ کیا کیا سوال نہیں پوچھیں گے اس سے؟

خان کے یک طرفہ اور بھٹکے ہوئے خیالات برابر میری سمجھ میں آ رہے تھے اور میرا اندرون برابر مجھ سے کہے جا رہا تھا کہ خان اس حور پری سے الگ قسم کے تعلقات رکھنا چاہتا ہے۔ غالباً وہ اسے داشتہ بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ خود ہی بول اٹھا: ''اس کمبخت عورت کو بول چکا ہوں۔ صاف صاف سمجھا بھی چکا ہوں۔ میرے آگے پیچھے اب کوئی نہیں رہا۔ بیگم فوت ہو چکی ہے۔ دو اللہ کے دیئے ہوئے پیارے پیارے بچے ضرور ہیں۔ اپنی دادی کے ساتھ پاکستان میں رہتے ہیں۔ میں ہر پہلی کو مال متاع بھیج دیتا ہوں۔ وہ بھی خوش، میں بھی خوش اور ہم سب کا اللہ بھی خوش۔''

''کیا ہوا تھا بیگم کو؟۔۔۔ ان کی عمر زیادہ تو نہ رہی ہوگی؟''

''تمہاری عمر کی ہوں گی۔ یہی تیس بتیس۔ پیاز کاٹ رہی تھی۔ چھری سے ہاتھ کٹ گیا۔ چھری زنگ کی ماری تھی۔ ڈاکٹر نے ٹنچر لگا کر اور پٹی باندھ کر گھر بھیج دیا۔ اس خنزیر نے بیگم کو انجکشن تک نہ لگایا۔ دو روز میں زہر پورے بدن میں اتر گیا اور وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ کیا کہتے ہیں اس کو۔۔۔ ٹے ٹے ٹنینٹ۔'' مجھے اس کی جہالت پر کھل کر ہنسی آئی۔ مگر میں نے خود کو قابو میں رکھا کہ بات

گاؤں کی ایک سیدھی سادی عورت کی ہورہی تھی۔لیکن میں یہ کہے بغیر نہ رہ پایا:

''میں سمجھ گیا۔آپ کی بیگم کو TETANES ہو گیا تھا۔''

''ہاں ہاں، بس وہی وہی۔۔۔اپنے ڈاکٹر تو عوام سے بھی گئے گزرے ہیں، سالے ان پڑھ۔ مرض سے زیادہ مریض کی جیب پر نظر رکھتے ہیں۔ BLOODY STUPID, ROTTEN EGGS۔وہ اپنی نیم خواندگی کا اظہار انگریزی الفاظ بول کر کر رہا تھا۔لیکن مجھے اس سے کچھ کچھ ہمدردی بھی ہو چلی تھی۔

''خان مجھے افسوس ہے۔تم جوانی میں ہی اپنی بیگم کو کھو بیٹھے۔۔۔مگر خدا تمہیں سلامت رکھے۔۔۔ تم ماشااللہ ابھی جوان ہو۔اپنا گھر پھر سے بسانے میں کیا حرج ہے؟''

''ارادہ تو یہی ہے۔مگر کوئی ملے تو؟''

مجھ کو قدرے شرارت سوجھی اور میں نے خان کا اندرون بھی جاننا چاہا۔

''قدرت تم پر سدا مہربان رہی ہے۔اس نے ایک ایسا پنچھی تمہارے آنگن میں بھیجا ہے جو تمہارا ہم مذہب بھی ہے۔۔۔اور اب تم دونوں اوپر والے کی مرضی سے اکیلے بھی ہو گئے ہو۔''

''یہی تو رونا ہے سنگھ۔وہ الو کی پٹھی مانے جب ناں؟۔۔۔ چھ مہینے سے یہاں پڑی ہے۔کوئی آگے نہیں، کوئی پیچھے نہیں۔قسم پروردگار کی ہر سنڈے کو صبح کرایہ بٹورنے نکلتا ہوں تو پوچھ مت، اس کے کمرے میں پہونچ کر کتنی تکلیف ہوتی ہے مجھ کو؟''

مجھے اس کی بکھری بکھری اور بے ربط باتیں اپنی طرف متوجہ کیے جارہی تھیں۔

''خان بے دھڑک کہو جو بھی کہنا ہے تم کو؟''

''کیا کہوں، اس کے کمرے میں کرایہ وصول کرنے کو قدم رکھتا ہوں تو وہ علیک سلیک کے بعد رینٹ بک میں رکھے ہوئے نوٹ میری طرف بڑھا دیتی ہے۔اور میں کرایہ پا کر اس بد بخت سے کہتا ہوں۔۔۔بی بی اس جہاں میں اب ہم دونوں اکیلے رہ گئے ہیں، اپنے وطن سے ہزاروں میل دور۔۔۔میں بندوبست کر دیتا ہوں تیرے طلاق کا، تجھے کوئی پریشانی نہ ہوگی۔سب خرچہ میرا ہوگا۔''

''پھر؟''

''پھر کیا کہوں؟ وہ شوخ نظروں سے مجھ کو دیکھ کر مسکراتی ہے اور مسکراتی چلی جاتی ہے۔ میں دل پر ہاتھ رکھ کر فوراً کہتا ہوں۔۔۔تو ایک بار ہاں تو کر، پھر دیکھ تماشا پیار کا۔۔۔ یہ مکان تیرا، میں تیرا۔ تو لینڈ لیڈی اور میں تیرا عاشق گلفام، تیرا غلام۔۔۔مگر وہ الو کی دُم خاموش کی خاموش۔ کوئی حرکت نہیں۔ کوئی جواب نہیں۔ ہاتھ میں رینٹ بک تھامے کھلے دروازے کو لگاتار دیکھا کرتی ہے۔''

ہر شام فیکٹری میں جانے سے پہلے میں کچن میں ضرور جایا کرتا تھا۔ کچن سانجھا تھا۔ بڑے سائز کا فریج بھی سانجھا تھا۔ اس کے درمیان ٹائپ شدہ موٹے موٹے حروف میں ایک نوٹس چسپاں تھا۔

" PLEASE KEEP YOUR HAND TO YOUR FOOD ONLY -

ALLHA IS WATCHING YOU - "

میں ہر وقت ویک اینڈ پر دو تین سالن بنا کر فریج کے بالائی خانے میں ڈال دیا کرتا تھا اور پورا ہفتہ ان کی بدولت شکم پُری کیا کرتا تھا۔ لیکن بعض کرائے دار کبھی کبھار موقع پا کر میرے کھانوں پر حملہ کر دیا کرتے تھے۔ مجھے غصہ تو بے انتہا آتا، مگر یہ خیال میرے غصے کو کم کر ڈالتا کہ ان کرائے داروں کی ضرورت مجھ سے زیادہ رہی ہوگی۔ پھر یہ بھی عین ممکن تھا کہ بہت سے جوان ہفتے کے آخر میں پھانک ہو جاتے ہیں۔ یہ انوکھے تجربے مجھے فیکٹری میں بارہا ہو چکے تھے۔ میرے کئی رفیق کار مجھ سے کبھی پچاس پینس، کبھی ایک پونڈ ادھار لیا کرتے تھے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ وہ ادھار لی ہوئی رقم خود لوٹائیں تو لوٹائیں۔ میں انہیں یاد دہانی کبھی نہ کرایا کرتا تھا۔ کچن میں اس حور پری سے بھی ملاقات رہا کرتی تھی۔ ہم کبھی موسم، کبھی مکان، کبھی مہنگائی، کبھی مغربی تیز گام زندگی اور کبھی بے ضرر سی نجی باتیں بھی کر لیا کرتے تھے۔ بے تکلفی بڑھنے پر اس نے بتایا کہ وہ انشورنس کمپنی میں ملازم ہے۔ اکیلی ہے اور پاکستانی شہر کراچی کی رہنے والی ہے۔ میں نے بھی اسے اپنے پس منظر سے آگاہ کیا کہ میری پیدائش تمہارے ملک کے تاریخی شہر پشاور کی ہے۔ بچپن دہلی میں گزرا، جوانی بمبئی میں اور اب میں بہتر زندگی اور مستقبل نان و نفقہ کی تلاش میں یہاں

چلا آیا ہوں۔ دہلی شہر کا نام سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ پلکیں جھپکائے بنا وہ مجھ کو غور سے دیکھتی رہی۔ جب مزید برداشت نہ ہوا تو پوچھ بیٹھی: ''دہلی میں تمہارا ٹھکانہ کہاں تھا؟''

''قرول باغ۔ اجمل خان روڈ۔''

وہ چھلانگ لگا کر اپنی جگہ پہ دوبارہ کھڑی ہو گئی۔ پلیٹ اس کے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچی تھی۔ پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنی جائے پیدائش بیان کی۔

''میں دلی میں پیدا ہوئی تھی۔ قرول باغ۔ بیڈن پورہ گلی نمبر گیارہ۔۔۔ میرے ابو طبیہ کالج میں طرح طرح کے معجون اپنی نگرانی میں تیار کرایا کرتے تھے۔ وہ ماہر معجون تھے۔ کالج کے سامنے اجمل خان پارک تھا۔ ہم بہن بھائی اور رشتہ دار وہاں کھیلا کرتے تھے۔''

اس روز میری چھٹی تھی اور میں آلو قیمہ بنا رہا تھا۔ اس کی اٹھتی ہوئی مہک اس کے نتھنوں سے گزری تو وہ بے ساختہ بول اٹھی:

''میں تو سمجھی تھی تم شاکاہاری ہو؟''

ایک نظر میں نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ پھر جاننا چاہا:

''اس لفظ سے تمہاری واقفیت کیونکر ہوئی؟''

''آریہ سماج روڈ کی نکڑ پر ایک شاکاہاری ڈھابہ ہوا کرتا تھا ہوشیار پوریوں کا۔ ابو وہاں سے اڑد دال، مٹر پنیر، راج ماہ اور توے کی چپاتیاں لایا کرتے تھے۔ پورا خاندان بڑے شوق سے کھایا کرتا تھا۔۔۔ میں تو قسم خدا کی، دال چٹ کر جایا کرتی تھی۔''

میں نے ہانڈی میں ڈوئی چلا کر قدرے طنز کیا: ''پھر تقسیم کے بعد تم پاکستان چلی گئیں اور میں ہندوستان چلا آیا۔''

''ہاں۔ یہ سب سیاست کا کھیل ہے۔۔۔ زمانہ گزرا اور اب ہم انگریزوں کے ملک میں ۱۹۷۴ء میں ملے ہیں۔''

میں اسے کیا جواب دیتا کہ میرے ولایت آنے کے اسباب کیا تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ یکسر معاشی تھے۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہ تھے۔ ورنہ کون شخص اپنے ماں باپ، بہن بھائی، دوست احباب اور

اپنے وطن عزیز کو چھوڑ کر پرائی دھرتی پر اجنبی بنا جیون گزارنا پسند کرتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنی شناخت بھی کھو بیٹھتا ہے۔

بیرون ملک کی مٹی میں غیر ملکی شخص کو اپنی جڑ لگانا سدا اسے دشوار رہا ہے۔ لیکن میں خوش نصیب تھا کہ میری جڑ وقت کے ساتھ ساتھ بیرونی معاشرے میں زمین پکڑتی چلی گئی۔ میں جسمانی اور مالی اعتبار سے آسودہ ہوتا جا رہا تھا۔ قرضہ اتر چکا تھا اور میں فضا میں ایک آزاد پنچھی کی مانند اُڑ رہا تھا۔ ذہنی یکسوئی بھی مجھے نصیب ہو رہی تھی۔ فیکٹری کا ماحول، از خود حرکت کردہ روبوٹ، مشینوں کا شور، پٹے سے گزرتے ہوئے سینکڑوں گرما گرم بسکٹ اور ان کی گرمائش اور ناک میں دھنستی ہوئی تیز خوشبو اب مجھ کو پریشان نہ کرتی تھی۔ جیون راس آنے لگا تھا۔ ذہنی جالے بھی صاف ہو رہے تھے۔ ایسے میں میں نے قلم اٹھا کر پردیس میں اپنا پہلا افسانہ ''مانگے کا اجالا'' قلمبند کیا۔ وہ چند ماہ کے وقفے کے بعد 'شمع' دہلی میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا۔ قارئین نے افسانے کی مخالفت اور موافقت میں اتنے خطوط رقم کیے کہ وہ متنازعہ فیہ قرار پایا۔ لیکن میں بے پناہ خوش تھا کہ پردیس میں لکھی گئی میری پہلی تخلیق کا بھرپور نوٹس لیا گیا ہے اور اسے اپنا جائز مقام بھی حاصل ہوا ہے۔
میں ویک اینڈ کی پہلی صبح میں جلد سو کر تیسرے پہر کو اٹھ جایا کرتا تھا۔ تاکہ رات میں پچھلی پانچ راتوں کی نیند پوری کر پاؤں۔ سنیچر اور اتوار کی شامیں میری اپنی ہوا کرتی تھیں۔ اب میں انہیں اپنے ساتھ ہی منایا کرتا تھا۔ نشاط خان کی صحبت سے میں نے گریز کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ سابقہ نشستوں میں مجھے خبطی، موقع پرست، خود غرض اور بخیل محسوس ہوا تھا۔ میں اس شام کو اپنے کمرے میں بیٹھا جدید افسانہ نگار سریندر پرکاش کا شاندار افسانہ 'ساحل پر لیٹی ہوئی عورت' پڑھ رہا تھا۔ افسانہ اپنی جگہ کمال تھا۔ سریندر نے اس میں جو پراسراریت کی فضا پیدا کی تھی، وہ بلاشبہ معرکہ خیز تھی۔ میں اس کے سحر میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے خان بہادر کو پنجابی زبان میں موٹی سی گالی دی اور دروازہ کھولتے وقت یہ خیال بھی آیا کہ آدمی کو اتنا بڑا مفت خورہ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ وہ شراب کی خاطر بن بلائے دوسروں کے در پر دستک دیتا پھرے۔ مگر

دروازہ کھولا تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سلمہ آرزو میرے سامنے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلائے کھڑی تھی۔ وہ ہاتھ میں ''شمع'' کا تازہ شمارہ تھامے مجھ کو تعجب خیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی تحریر سے بہت سی باتیں واضح ہو چکی تھیں۔ وہ اپنی چوڑی پیشانی پر بل ڈال کر بول اٹھی:

''کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟''

بھلا میں کون ہوتا تھا انکار کرنے والا۔ وہ ادائے بے نیازی سے قدم اٹھاتی ہوئی اندر چلی آئی اور میرے قریب چند ہاتھ کے فاصلے پر بیٹھ گئی۔ ہمارے درمیان کباب کی پلیٹ، وہسکی کا اَدّھا، پانی کا جگ، میرا شراب سے ادھ بھرا گلاس سگریٹ کی ڈبیا اور ایش ٹرے دھری تھی۔ وہ نہایت سنجیدگی سے مجھ کو اور ہمارے درمیان رکھے ہوئے لوازمات کو دیکھتی رہی۔ پھر بول اٹھی: ''تم نے یہ ضرور بتایا تھا بسکٹ فیکٹری میں کام کرتے ہو۔ چھڑے چھانٹ ہو۔۔۔ پر یہ بتانے کی زحمت نہ کی کہ ادیب بھی ہو؟ کہانیاں بھی لکھتے ہو؟''

ایش ٹرے میں رکھے ہوئے سگریٹ سے بل کھاتا ہوا دھواں اٹھ رہا تھا مجھے اس کی طلب شدت سے ہوئی۔ ایک گہرا کش کھینچ کر پوچھا:

''تم کو یہ کیونکر احساس ہوا کہ میں ادیب ہوں اور کہانی کار بھی ہوں؟''

''میں اتنی معصوم نہیں ہوں، اس کہانی میں جو علاقہ، ماحول، سڑکیں اور دوکانوں کا نقشہ تم نے کھینچا ہے۔ میں بھی اس کا حصہ ہوں۔''

میں ہنس دیا، لیکن ایسا لگا کہ میری چوری پکڑی گئی ہے اور میں ایک گنہگار کی حیثیت سے اس کی عدالت میں موجود ہوں۔

''کمرے میں کوکا کولا یا لیمن ایڈ تو ہے نہیں۔ کیا تم ایک آدھ جام پینا پسند کرو گی؟

''نہیں میں شراب نہیں پیتی۔ البتہ سگریٹ دل کھول کر پیتی ہوں۔''

میں نے ڈبیا اٹھا کر اس کی طرف اچھال دی اور کہا: ''اگر ایسا ہے تو پھر پانی سے ہی دل بہلاؤ۔''

''ایک شرط پر؟''

میں سوالیہ نظروں سے دیکھتا شرط جاننے کا انتظار کرنے لگا۔

''تم میرے ساتھ کوئی زبردستی یا زیادتی نہیں کرو گے؟''

''زبردستی تو میں ہرگز نہیں کروں گا۔'' پھر میں نے ذرا رومانی بن کر کہا: ''لیکن تمہاری آنکھوں نے اگر مسکرانا شروع کر دیا یا ان کے تقاضے کچھ الگ سے ہوئے تو پھر بندہ کوئی گارنٹی نہیں دیتا۔''

''تم نے واقعی دلی شہر کا پانی پی رکھا ہے۔۔۔ خرانٹ لگتے ہو؟''

اس پر ہم دونوں ہنس دیئے۔ اس نے خود ہی پانی کا گلاس تیار کیا۔ میں دھیرے دھیرے شراب پیتا رہا اور وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر کر اور سگریٹ پھونک کر میرا ساتھ دیتی رہی۔ ہم رات دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ جس دلکش طریقے سے میرے ہاں وارد ہوئی تھی، اسی ڈھنگ سے واپس بھی لوٹ گئی۔ اس دوران اس نے اپنی زندگی کے چند ایک المناک واقعات بھی بیان کیے۔ ان میں اس کی ذاتی محرومیاں، مرد مسلط معاشرے کی ناہمواریاں۔ خاندانی زیادتیاں اور ناخوشگوار حالات بھی شامل تھے۔ انہیں دہرا کر اس نے جتایا کہ وہ پُلِ صراط سے گزری ہے۔ میں اس کی ہر بات ہر تجربہ بہ غور سنتا رہا۔ میرا نشہ قدرے ہرن ہو چکا تھا۔ مگر میں مداخلت کیے بغیر اس کا ہر لفظ ہوش گوش سے سنتا رہا۔

اس رات سونے سے پہلے سلمہ آرزو کی تمام باتیں میرے اندرونی نظام میں گردش کرتی رہیں اور میں اپنی پوری عقل وفہم کے ساتھ ان پر غور کرتا رہا۔ وہ کراچی کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ تعلیم یافتہ تھی۔ تازہ تازہ ایم اے میں تاریخ کے مضمون میں داخلہ لیا تھا کہ ٹھیک ان دنوں ریاست رام پور کے نوابی خاندان کی ایک شاخ سے رشتہ چلا آیا۔ لڑکا سول انجینیر تھا اور لندن میں رہائش پذیر تھا۔ سلمہ کا بڑا بھائی بے پناہ خوش ہوا کہ ایک طرف تو رشتہ باوقار تھا اور دوسری طرف وہ اپنی آخری ذمہ داری سے بھی نجات پا رہا تھا۔ مگر سلمہ زیادہ خوش نہ تھی۔ وہ تعلیم کے بعد ہی شادی کے بندھن میں بندھنا چاہتی تھی۔ مگر بھائی اور بھاوج کے اصرار کے آگے وہ مجبور ہو کر رہ گئی۔ والدین گزر چکے تھے۔ مگر وہ اتنا کچھ چھوڑ گئے تھے کہ وہ بذاتِ خود کسی پر بوجھ نہ بنتی۔ لیکن بھاوج طرار تھی۔ وہ لالچ کی پوٹلی کلیم (CLAIM) میں الاٹ کردہ مکان اور شہر کے مضافات ناظم آباد میں مختصر سی زمین پر اپنا پورا قبضہ چاہتی تھی۔ سلمہ کے والد ماجد اس زمین پر معجون بنانے کی تجربہ گاہ تعمیر کرنے

کے خواہشمند تھے ۔ وہ بٹوارے کے بعد نہایت ہی کم گو ہو گئے تھے ۔ دن بھر خود میں گم رہتے ۔ ملازمت کے دوران بھی اپنے کام سے ہی مطلب رکھتے ۔۔۔ پاکستان ہجرت کرنے پر زیادہ عمر نہ پائی تھی ۔ مشکل سے چار برس جئیں ہوں گے ۔ یہ بتاتے ہوئے اس کی آنکھیں گیلی ہو گئی تھیں ۔ اس نے رومال سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا تھا: ''ابو کہا کرتے تھے ۔ پنڈت نہرو، پٹیل، جناح اور لیاقت نے کبھی یہ نہ سوچا کہ تقسیم کے بعد ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور پارسیوں کا کیا بنے گا؟ آنے والی نسلیں کس طرح پنپیں گی؟ ۔۔۔ بٹوارے کے واسطے سب سے زیادہ شور لکھنو اور علی گڑھ کے مسلمانوں نے مچایا تھا ۔ اب سالے منہ چھپاتے پھرتے ہیں ۔''

سلمہ کو جب یقین ہو گیا کہ میں اس کی ہر بات کو سنجیدگی سے سن کر اسے اہمیت دے رہا ہوں اور ساتھ میں ہمدردی جتا کر فاصلے بھی کم کر رہا ہوں تو وہ مزید کھُلتی چلی گئی ۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس نے اپنا گھر بار خود چھوڑا ہے ۔ اسے اپنے شوہر کی بعض عادات پسند نہ تھیں ۔ پھر وہ جب کسی کا دامن چھوڑ دیتی ہے تو مڑ کر اسے دیکھنا پسند نہیں کرتی، یہ اس کا کردار ہے اور اس پر وہ نازاں بھی ہے ۔ میں بستر پر کروٹیں بدلتا سلمہ اور اس کی باتوں کے متعلق دیر تک سوچتا رہا ۔ اس کے انکشافات کبھی کبھی ایک دوسرے سے ٹکرا بھی جاتے تھے ۔ اور کبھی وہ مجھے زمانے کی ستائی ہوئی مظلوم عورت بھی لگا کرتی تھی ۔ یہی سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی تھی ۔

اگلی صبح خدائی چھٹی کا دن تھا ۔ میں حسبِ معمول دیر سے اٹھا ۔ خان کے گھر میں پرندے بھولے بھٹکے بھی دکھنے میں نہ آئے تھے ۔ مگر اس صبح منہ ہاتھ دھو کر جب میں نے کھڑکی سے پردے ہٹائے تو پرندوں کی فوج خان کے عقبی اُجڑے باغ میں آزادنہ گھوم پھر رہی تھی ۔ رنگ برنگے پرندے چھوٹے چھوٹے پروں پر پھُدکتے اور دانہ چگتے مجھے بے حد حسین دکھائی دیئے ۔ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ موسم بدلا جاتا ہے ۔ موسمی پرندے ہجرت کر کے واپس لوٹ آئے ہیں ۔ خیال آیا کہ یہ پرندے کتنے خوش قسمت ہیں ۔ دیس بدیس گھومتے پھرتے ہیں ۔ نہ کوئی ویزا، نہ پاسپورٹ اور نہ ہی ٹکٹ کا کوئی خرچہ ۔ پنکھ کھولے اور پرواز کر گئے ۔

دن بڑے ہونے لگے تھے اور اُجالا دیر تک رہتا تھا ۔ اگلے ویک اینڈ پر سلمہ آرزو پھر سے میرے

کمرے میں موجود تھی ۔ اِس بار میں نے اس کے واسطے ہر طرح کا مشروب لا کر رکھ چھوڑا تھا۔ خوردونوش کا سامان بھی کثرت سے موجود تھا۔ مگر ان کو چھونے سے پہلے اور گلاس کسی مشروب سے بھرنے سے پہلے وہ بولی اٹھی: ''اگلے ویک اینڈ پر تم میرے مہمان رہو گے ۔ اگر انکار کیا تو اسی وقت گلاس کو چھوئے بغیر چل دوں گی۔''

یہ سن کر میں خوش ہو گیا کہ پردیس میں بیٹھے بٹھائے میری قسمت کھل رہی ہے۔ مجھے ایک سلجھی ہوئی، ذہین، پڑھی لکھی اور سنجیدہ عورت کی صحبت نصیب ہو رہی تھی۔ اس کے محسوسات بھی کم وبیش یہی رہے ہوں گے۔ اسی کارن اس نے مجھے اگلے ہی ہفتے اپنے کمرے میں آنے کی دعوت دی تھی اس شام بھی اس نے ڈھیر ساری باتیں کی تھیں۔ مگر اس نے اپنی شادی شدہ زندگی اور شوہر سے علیحدگی کے متعلق موہوم سا اشارہ بھی نہ کیا تھا۔ دل نے چاہا کہ اس کی خانگی زندگی کے حوالے سے کچھ پوچھوں، کچھ دریافت کروں۔ مگر دماغ نے دل کا ساتھ دینے سے صاف صاف انکار کر دیا۔

اس شام میں ہم نے کھانا اکٹھے کھایا۔ دوپہر میں اسے پکا کر میں نے فریج میں ڈال دیا تھا اور دعا گو تھا کہ کسی کرائے دار کے ناپاک ہاتھ اس تک نہ پہونچیں۔ تین چار پیگ مجھ پر اثر انداز ہو چکے تھے۔ میں خاصا ترنگ میں آ چکا تھا اور گنگنائے جا رہا تھا۔ شعر سننے یا کہنے کی کیفیت مجھ پر طاری ہو چکی تھی ۔ سلمہ آرزو شعر بھی کہا کرتی تھی ۔ گذشتہ ملاقات میں اس نے مجھ کو فیض، فراق، ناصر کاظمی اور آرزو لکھنوی کے بعض اشعار ترنم میں اور بعض تحت اللفظ میں سنائے تھے اور میں بچھ بچھ گیا تھا۔ میرے مسلسل اصرار پر کہ وہ اپنا تخلص آرزو رکھنے کی وجہ بیان کرے تو وہ کھل کھلا کر ہنس دی۔ اُس پل وہ اپنے نسوانی حسن سے کہیں زیادہ حسین دکھائی دی تھی اور اپنی عمر سے بھی نصف لگی تھی۔

''کالج جانا شروع کیا تو آرزو لکھنوی صاحب کا دیوان ''سُریلی بانسری'' ہاتھ لگ گیا۔ ان کی شاعری نے میرے دل، دماغ، سوچ اور جذبات میں ہلچل مچا دی۔ میں ان کی دیوانی ہو گئی اور آج بھی ہوں۔۔۔ انہی دنوں میں نے ایک بھارتی فلم دیکھی تھی۔ نام تھا آرزو۔ دلیپ کمار اور کامنی کوشل تھے اس میں۔۔۔ یاد ہے تمہیں؟'' میں نے نفی میں گردن ہلا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

''مجھے فلم سے زیادہ فلم کا نام پسند آیا تھا، اور میں سلمہ سے سلمہ آرزو بن گئی۔''

''واہ۔۔۔کیا جواز پیش کیے ہیں تم نے؟ مگر تمہارا خاندانی نام تو کچھ اور رہا ہوگا؟''

''میرا پیدائشی نام سلمہ خانم صدیقی ہے۔ ہمارا سلسلہ نسب ہمارے جداعلی حضرت ابوبکر صدیق سے جا کر ملتا ہے...... تم تو اردو کے ادیب ہو، کوئی وجہ نہیں کہ تم ہمارے جداعلی کے نام سے واقف نہ ہو؟''

''حضرت ابوبکر کے متعلق میں زیادہ معلومات تو نہیں رکھتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ بزرگ ہو چکے تھے اور اپنی طبعی موت مرے تھے۔ البتہ تمہارے بقیہ تینوں خلیفہ قتل ہوئے تھے۔''

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش اور سنجیدہ ہوگئی تھی۔ پھر گہرے افسوس کے ساتھ گویا ہوئی:

''ہماری اسلامی تاریخ قتلوں اور قاتلوں سے اٹی پڑی ہے۔۔۔ یہ ہمارا المیہ بھی ہے۔''

اس کی صاف گوئی نے مجھ پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ ورنہ لوگ باگ اپنے اپنے مذہب کے کمزور پہلوؤں پر پردے ڈالتے نظر آتے ہیں۔ سلمہ مجھ کو واقعی اچھی لگنے لگی تھی اور میں خود کو اس کے دل کے نزدیک کھڑا پا رہا تھا۔ لیکن میں خود کو کسی بھی طور اس کی زندگی میں الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ وجہ صاف تھی۔ وہ ایک الگ مذہب سے تعلق رکھتی تھی (گو کہ میں دنیاوی دیواروں میں گھرا ہوا شخص ہرگز نہ تھا) دوسرا اہم پہلو اس کی ازدواجی زندگی تھی، جو بحران زدہ تھی۔ اس کے متعلق خان نے مجھے کئی معلومات فراہم کر رکھی تھیں۔ مجھے ان میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ اس نے مجھ کو نہایت سنجیدہ پایا تو بول اٹھی:

''میں اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو Y W C A کے ہوسٹل میں شفٹ کر جاؤں گی۔'' مجھے جھٹکا لگا کچھ یوں کہ وہ میری زندگی سے الگ ہوئی جا رہی ہے۔ حالانکہ میرا اور اس کا تعلق محض دوستانہ تھا، اس کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ مگر اس کی صحبت مجھ کو پسند آنے لگی تھی۔ وہ دانشمند تھی، گہرا ادبی ذوق رکھتی تھی، تعلیم یافتہ تھی اور جوان بھی تھی۔

''مگر کیوں؟ یہاں کوئی تکلیف ہے تم کو؟''

''ہاں ہے۔۔۔ ممکن ہے کہ خان نے تمہارے کان بھی اس اسٹوری سے بھر دیئے ہوں کہ میرے شوہر نے مجھے گھر سے نکال کر باہر کھڑا کر دیا ہے۔ اور میں ایک آوارہ بدچلن عورت ہوں۔۔۔ اور

ان دنوں نیا سہارا ڈھونڈتی پھرتی ہوں۔''
یہ سننا تھا کہ خان بہادر کی پوری شخصیت گندے نالے میں بہہ گئی۔ سلمہ کو غایت درجہ خاموش پا کر میرے ہونٹ بھی سل چکے تھے۔ اس نے نیا سگریٹ سلگایا۔ دھواں ادھر ادھر بکھیرا۔ میں ذاتی طور پر یہ پوچھ کر اس کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کی اپنے شوہر کے ساتھ ان بن کیونکر ہوئی؟ اور اس نے اپنے شوہر کو کیوں چھوڑا؟ اس دوران اس نے اپنی تمام اشیاء کو سمیٹا، کچھ دیر پلکیں جھپکائے بنا مجھ کو دیکھتی رہی۔ ان میں اپنائیت بھی تھی اور بے گانگیت کا احساس بھی شامل تھا۔ گو کہ میں اپنی ترنگ میں دوسرے تیسرے آسمان پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں کئی سوالات بھی پائے تھے۔ مگر میں خاموش کا خاموش ہی رہا۔ اس نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے یاددہانی کرائی:
اگلے سنیچر کے روز تم کو میرے ہاں آنا ہے۔ بھولنا مت۔''
میرے ہونٹ جوں کے توں سلے رہے۔ لیکن میری چڑھتی آنکھیں اور لچکتی گردن نے ٹیڑھا ٹیڑھا ہو کر اس کا سندیش قبول کر لیا تھا۔

•

مہانگر میں ''وقت'' کئی بھیس بدل کر عوام کے قریب سے گزر جاتا ہے، کسی کو احساس تک نہیں ہوتا۔ اور جب کوئی شخص اس کا نوٹس لیتا ہے تو کلینڈر اپنی کئی تاریخیں بدل کر جانے کہاں سے کہاں پہونچ چکا ہوتا ہے۔ سات دن پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔ اس دوران میں ہر دم سوتے جاگتے یہی سوچتا رہا کہ سلمہ آرزو کے در پر دستک دیتے وقت میرے ہاتھوں میں کس قسم کا تحفہ ہونا چاہئے؟ سوچا کہ پھولوں کا گلدستہ مناسب رہے گا۔ لیکن اس خیال کے ساتھ اسے رد کر دیا کہ کہیں وہ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ میں اس کے عشق میں گرفتار ہوا جا رہا ہوں۔ مگر خاندانی اور تہذیبی روایت کے تحت میرا اس کے ہاں خالی ہاتھ جانا خلاف شان تھا۔ لہٰذا ساؤتھ ہال، جہاں ایشیائی لوگوں کی گنجان آبادی واقع ہے، وہاں کے ایک کتب فروش وردی برادرن کی دکان سے میں دیوان داغ کا ایک شعری نسخہ خرید کر اس کی چوکھٹ پر حاضر ہو گیا۔

اس کا کمرہ میرے کمرے سے کشادہ تھا۔ درحقیقت وہ مکان کا ماسٹر بیڈ روم تھا اور اس میں مختصر سا باتھ روم بھی جڑا ہوا تھا۔ کمرہ صاف ستھرا تھا۔ فرنیچر کا ہر ٹکڑا اپنی جگہ پہ قرینے سے دھرا تھا۔ آمنے سامنے رکھی کرسیوں کے درمیان میز پر پینے پلانے کے لوازمات، چمکتی رکابیوں کے ساتھ موجود تھے۔ سلمہ نے مختصر سی قمیض کے ساتھ غرارہ پہن رکھا تھا۔ میری آنکھیں اس کے لباس، حسن اور شخصیت سے الگ نہیں ہو پا رہی تھیں۔ شاید وہ اس وجہ سے بھی زیادہ خوش نظر آ رہی تھی کہ اس کا کوئی دوست، اس کے کمرے میں وارد ہوا ہے، جسے وہ سمجھ سکتی ہے، محسوس کر سکتی ہے اور اپنے مسائل بھی رفتہ رفتہ بیان کر سکتی ہے۔ تحفہ پا کر وہ اسقدر خوش ہوئی تھی کہ اگر ہمارے درمیان مشرقی اقدار کے پردے حائل نہ ہوتے تو وہ بڑھ کر میرے گال سرخ کر ڈالتی۔ اس نے آنکھوں سے میرا شکریہ ادا کیا اور ان ہی کی مدد سے مجھے بیٹھنے کو اشارہ کیا۔ قریب ہی ایک الیکٹرک گرل رکھی تھی۔ سلمہ نے اس کا دروازہ کھولا اور ایک پلیٹ نکال کر میز کے وسط میں رکھ چھوڑی۔ پھر ایک خالی رکابی اٹھا کر میری طرف بڑھائی: ''لو کھاؤ گرم گرم شامی کباب ہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے وہسکی کا گلاس میرے واسطے تیار کیا اور پھر اپنے واسطے بھی۔ میں دنگ رہ گیا۔ سابق نشستوں میں اس نے ہوشربا مشروب کو چھوا تک نہ تھا۔ میرے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ اور تاثرات کو دیکھ کر وہ بول اٹھی:

''چونک گئے ناں؟ ۔۔۔ میں تب تک اس شخص کے ساتھ شریکِ مے نہیں ہوتی۔ جب تک اس کو جان نہ لوں، پہچان نہ لوں ۔۔۔ تم خاندانی آدمی ہو۔ لیکن حالات کے مارے ہو۔ ورنہ سونے کا دل رکھتے ہو اور ہمدرد نظر بھی۔''

مدت کے بعد شامی کباب دیکھنے میں آئے تھے۔ پہلا ٹکڑا زبان پر رکھتے ہی میں بمبئی شہر کے بغدادی ریسٹورنٹ میں پہونچ گیا، جہاں میں اکثر شاعر ندا فاضلی اور دیگر ادبی دوستوں کے ساتھ کباب کھانے جایا کرتا تھا۔ مجھے سلمہ کا کمرہ واقعی پسند آیا تھا اور میں کہے بنا نہ رہ سکا:

''اتنا اچھا کمرہ تم چھوڑ کر جا رہی ہو؟ ایسا کمرہ تم کو کہاں ملے گا؟''

''ٹھیک کہا تم نے؟ پر کیا کروں؟ مجبور ہوں۔ جگہ چھوڑنے کی وجہ تم جانتے ہی ہو؟''

''ہاں۔ خان بہادر آف نوشہرہ فیم آف پاکستان۔''
وہ ہنس دی۔ پھر قدرے سنجیدہ ہو کر بولی:
''مرد کی فطرت سدا یہی رہی ہے کہ وہ عورت کو جب پریشان، مجبور اور بھری دنیا میں اکیلا پاتا ہے، تو اس کے ساتھ کبھی زبردستی، کبھی لالچ اور کبھی سبز باغ دکھا کر اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہتا ہے۔''
''مگر تم خان سے صاف صاف کہہ دو کہ تم اس کے ساتھ کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتیں ۔۔۔ بس کرایہ دیتی جاؤ اور رہتی جاؤ۔''
''یہی تو رونا ہے۔ اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ اس ملک میں اب میرا کوئی نہیں رہا۔ میں بالکل اکیلی ہوں۔ طلاق کا انتظار ہے۔ پھر وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہر عورت مالی تحفظ چاہتی ہے اور میں مکان کے لالچ میں اس کا ہاتھ تھام لوں گی ۔۔۔ جانتے ہو جب وہ ہر سنڈے کو کرایہ وصول کرنے آتا ہے تو مجھ سے کیا کہا کرتا ہے؟''
''کیا؟''
''کیوں سلمہ بی بی۔'' وہ خان کی نقل اتار کر بولی: ''تم نے اپنا فیصلہ نہیں سنایا۔ مجھ کو انتظار ہے تیرے جواب کا۔ ایک بار ہاں کر دو۔ قسم خدا کی، تیری دنیا بدل جائے گی اور میری بھی ۔۔۔ لوگ باگ طلاق شدہ عورت کا ہاتھ مشکل سے پکڑتے ہیں اس ملک میں۔ میں نے تو تیرا ہاتھ مانگا ہے ۔۔۔ لیکن میں کوئی جواب دیئے بغیر رینٹ بک اس کی طرف بڑھا دیتی ہوں اور کھلے دروازے کو دیکھنے لگتی ہوں۔''
''پھر بھی وہ نہیں سمجھتا؟ سالا چکنا گھڑا۔''
میری ہنسی میں شامل ہو کر اس نے بھی اپنا گلاس اٹھا لیا۔ میں نے اسے سنجیدگی کے دائرے سے آزاد کرانے کی خاطر مذاقاً کہا:
''ویسے سلمہ بی بی ۔۔۔ خان کی تجویز بُری نہیں ہے ۔۔۔ وہ صحت مند پٹھان ہے، مالدار ہے اور سب سے بڑی بات لینڈ لارڈ بھی ہے۔''
وہ کھلکھلا اٹھی اور جواباً بولی:

''خان اَن پڑھ ہے اور میں پڑھی لکھی۔ وہ قبائلی آدمی ہے اور میں بڑے شہروں کی پلی بڑھی۔۔۔ رہا سوال مال متاع اور جائداد کا تو وہ میرے نزدیک بس کی ٹکٹیں ہیں۔ اس جاہل کے ساتھ آدھا دن بھی کاٹنا مشکل ہوگا۔''

گلاس خالی ہو چکے تھے۔ اس نے نئے تیار کیے۔ تین چار گھونٹ بھر کر وہ سالم کباب نصف منٹ میں چٹ کر گئی۔ پھر میری آنکھوں میں اتر کر برابر مجھ کو دیکھتی رہی۔ لگا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنے کی آرزومند ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ وہ میری آنکھوں سے ہو کر میری ذات میں ہلچل برپا کیے جا رہی تھی۔ خیال آیا کہ میں کون سا گنگا پتر بھیشم پتامہ ہوں جس نے دیوتاؤں کو ساکشی مان کر جیون بھر برہم اچاریہ رہنے کی پرتگیا اٹھائی تھی۔ اگر وہ مجھ میں دلچسپی رکھتی ہے تو پھر مجھے ہرگز پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔ اچانک وہ بول اٹھی:

''مجھے قطعاً افسوس نہیں کہ میں نے اپنے شوہر کو چھوڑا۔ بلکہ خوش ہوں کہ میں نے طلاق کی کارروائی شروع کی۔''

مجھے یقین سا ہو گیا کہ اب وہ گھڑی آن پہونچی ہے، جب وہ اپنے مسئلے کے ساتھ اپنا المیہ بھی بیان کرے گی۔ وہ خاموش، مگر گہری نظروں سے مجھ کو دیکھتی خود کو یقین دلاتی رہی کہ وہ جو بھی کہنا چاہ رہی ہے، اس پر مجھ جیسے شخص کو اعتبار آئے گا یا نہیں؟

''تم مخلص آدمی ہو اور مخلص دوست بھی۔۔۔ پھر ادیب بھی ہو اور میں تم کو ایک اچھا ادیب مانتی ہوں۔''

''تمہیں جو کچھ کہنا ہے، بے دھڑک کہو۔ تمہارا کہا میرے سینے میں دفن رہے گا۔''

''میری شادی کراچی میں ہوئی تھی۔ علی بیگ کی جھلک پاتے ہی میں اس پر ہزار جان سے فدا ہو گئی تھی۔ علی خوش شکل، خوش رنگ، خوش اخلاق اور خوش خوراک شخص تھا۔۔۔ ہماری شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ بھائی جان نے دل کھول کر خرچا کیا تھا۔ علی نے انگلینڈ پہونچ کر مجھے کاغذات بھیجنے میں ذرا بھی تاخیر نہ کی تھی۔''

اتنا کہہ کر جانے کیوں وہ خاموش ہو گئی تھی؟ میری سمجھ میں کوئی بھی منطق نہ آئی۔ پھر غالباً خود ہی

اسے احساس ہوا اور اس کے لب وا ہو گئے۔ مگر وہ جذباتی ہوتی جا رہی تھی۔

''کراچی سے رخصتی کے وقت بھاوج نے کہا تھا کہ مکان اور زمین کا حصہ جو تیرا تھا اس سے کہیں زیادہ تیرے بھائی نے تجھ پر خرچ کر ڈالا ہے۔ اب جہاز کا ٹکٹ بھی خرید دیا ہے۔ وہاں پہنچ کر پلٹ کر مت دیکھنا۔ یوں بھی لندن میں کس چیز کی کمی واقع ہوئی ہے؟ وہاں تو لوگ نوٹوں سے بھرا تکیہ لے کر سویا کرتے ہیں۔۔۔ اور بے چارے بھائی جان گردن جھکائے ایک کونے میں کھڑے سب سُن رہے تھے۔''

اس کی بھاوج کا رویہ جان کر میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ بیک ہوم ہمارے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یورپ تو ELDARADO ہے، جہاں پہونچ کر عوام دنوں میں ہی اپنی جھولیاں سونے سے بھر لیتے ہیں۔ مگر یہاں دل دماغ اور جسم کو اکھٹا رکھنے کی خاطر کتنی عرق ریزی کرنی پڑتی ہے، تب کہیں پیٹ کا مسئلہ حل ہوتا ہے۔ وہ جاندار گھونٹ بھر کر بولی:

''ہتھیر وایرپورٹ اس دوپہر کو چار بجے ہی گہرے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ سردی بے پناہ تھی۔ علی وہاں موجود تھا۔ اس نے ساری دنیا کے سامنے مجھے اٹھا کر چوم لیا تھا۔ اور مَیں شرما کر دوہری ہوگئی تھی۔'' گزرے وقت کو یاد کر کے وہ کھل اٹھی تھی۔ مگر سنجیدگی نے جلد ہی اسے گھیر لیا تھا۔ کھڑکی سے باہر دیکھ کر گویا ہوئی:

''مگر علی مجھ کو ایرپورٹ پر لینے اکیلا نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لاغر، ہم عمر انگریز بھی تھا، جو علی سے خوبرو تھا۔ سنہری بالوں کے نیچے سبز آنکھیں، اور گورا من موہنا چہرہ لیے وہ کالے رنگ کا ڈبل بریسٹ سوٹ میں بے حد حسین لگ رہا تھا۔ علی نے ڈیوڈ سے تعارف کراتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ اس کا یارِ غار ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے نیا سگریٹ سلگانا چاہا۔ مگر رک گئی۔ پھر رواں ہوئی: ''ڈیوڈ اور وہ ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھا کرتے تھے۔ ڈگریاں پانے اور الگ الگ نوکریاں ملنے پر بھی وہ الگ نہیں ہوئے۔ وہ آج بھی پرانے جذبوں اور رویوں کے ساتھ ملا کرتے ہیں۔۔۔ ڈیوڈ ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ نہایت مہذب اور ملنسار جوان تھا۔ مگر اس کی جسمانی حرکات، شرمیلا پن اور بول چال سے وہ دیگر جوانوں سے الگ تھلگ سا لگتا تھا۔''

''او مائی گاڈ۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا اور نئے گلاس تیار کرنے لگا۔
''میں ڈیوڈ کو بہت پسند کرتی تھی۔ مگر اس کی اداؤں سے وہ مجھے پورا مرد نہیں جان پڑتا تھا۔ کہیں کوئی کسر اس میں ضرور رہ گئی تھی۔ علی اس سے قریب قریب روزانہ ملا کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کو ڈیوڈ دنیا میں اب بالکل اکیلا ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ لیکن اب اس کے والدین بھی دنیا میں نہیں رہے۔ وہ کالج کے دنوں سے ہی میرے ساتھ بہت جڑا ہوا تھا۔ میں اسے چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں۔''

اس نے میرے ہاتھ کا بنا ہوا گلاس اٹھا کر اس کا احترام کیا۔ مگر گھونٹ بھرتے ہی اسے پانی کی کمی کا احساس ہوا۔ شاید میرا ہاتھ بھاری تھا یا وہسکی زیادہ مقدار میں انڈیل دی گئی تھی۔ میرے جلتے سگریٹ سے اس نے بھرپور کش لیے، گلاس میں پانی ڈالا اور ایک دفعہ پھر سے رواں ہوگئی۔
''زندگی خوشی خوشی گزر رہی تھی۔ میں علی کی ہر بات ہر حرکت پہ قربان جایا کرتی تھی اور اس کی ہر مانگ پر لُٹی لُٹی جاتی تھی۔ میں نے آکسفورڈ اسٹریٹ کے ایک بڑے اسٹور میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک ماہ جب میں ہر جوان عورت کی طرح خاص دنوں سے تھی تو علی نے میرا بدن اس طرف سے استعمال کرنا چاہا جو میرے نزدیک سر بسر غیر فطری اور غیر اخلاقی تھا۔ میں بستر سے چھلانگ لگا کر کھڑی ہوگئی اور میں نے صاف صاف انکار کر دیا۔ اس پر وہ چلا اٹھا:
''جانم۔ بیوی تو شوہر کی کھیتی ہوا کرتی ہے۔ وہ اس کی کاشت جس طرح سے چاہے کرے۔ یہ تو کتابوں میں بھی لکھا ہے۔''
مگر میں بھڑک اٹھی تھی اور میں نے اونچے سروں میں اس سے کہا تھا:
''دورِ جہالت کی بے ہودہ باتیں مت کرو۔ میں تعلیم یافتہ ہوں۔ اور اپنے بدنی حقوق سے بخوبی واقف ہوں۔ نہ تو مَیں تمہاری کھیتی ہوں اور نہ ہی تمہارے پانو کی جوتی۔۔۔ خبردار جو آئندہ اس قسم کی گھناؤنی حرکت کی تو؟''
''وہ میرا سرخ چہرہ دیکھ کر سرد پڑ گیا تھا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ مستقبل قریب میں اس نے وہ ذلیل حرکت پھر کبھی نہ کی تھی۔۔۔ میں نے یہ سوچ کر اسے معاف کر دیا تھا کہ عورت کے خاص دنوں

میں جوان مرد اپنی خواہش کے تحت صحبت سے دور نہیں رہ پاتا۔ لیکن میں غلطی پر تھی۔'' اس نے سگریٹ بجھا کر نیا سگریٹ سلگایا۔ چند گھونٹ حلق سے اتارے۔ میں صاف صاف دیکھ سکتا تھا کہ اس کے چہرے پر آگ سی لگ آئی ہے اور شعلے اس کی آنکھوں سے لپکنے لگے ہیں۔ میں نے پہلے کی طرح خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ ''میں ان دنوں جان لیوس اسٹور میں کام کرتی تھی اور برٹش میوزیم میں نوکری پانے کی کوشش میں تھی۔ ایک روز میری طبیعت اچانک زیادہ خراب ہوگئی۔ انگریز سپروائزر بڑی نیک عورت تھی۔ میری حالت دیکھ کر اس نے زبردستی مجھے گھر جانے کو کہا۔ لیکن گھر پہونچ کر جب میں نے دروازہ کھولا تو علی اور ڈیوڈ مادرزاد برہنہ اس غیر فطری فعل میں مشغول تھے، جسے سن کر ہی مجھ کو متلی ہوا کرتی تھی۔''

''او مائی گاڈ۔ تو علی بائے سیکسول (BISEXUAL) تھا؟''

''ہاں۔ میں غصہ سے پاگل ہوگئی تھی۔ گالیاں دیتے ہوئے جو بھی شئے میرے ہاتھ لگی، میں نے ان پر اچھال دی۔ میز سے گلدان بھی اٹھا کر دے مارا۔ وہ ڈیوڈ کے سر سے جاٹکرایا۔ مگر اس کی پرواہ کیے بغیر اس نے اپنے کپڑے اور جوتے سنبھالے اور پینٹ کو جلدی میں الٹا سیدھا پہن کر باہر دروازے کی طرف دوڑا۔ علی سخت نادم تھا کہ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ مگر اس نے اپنی صفائی میں یہ ضرور کہا تھا۔ سلمہ پلیز۔ مجھے معاف کرنا۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔'' تمام واقعات بیان کرکے وہ خاصی پریشان ہوچکی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی نم ہوچکی تھیں۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ اس وقت کتنے اذیت ناک عمل سے گذر رہی ہے اور اس کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ میں نے ہمدردی کے چند بول ادا کرکے اسے تاریک دائروں سے آزاد کرنا چاہا۔ مگر وہ اچانک بول اٹھی:

''میں اپنا سامان اٹھا کر گیسٹ روم میں رہنے چلی آئی۔ اور رات میں دروازہ بند رکھا کرتی تھی۔ علی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ مجھ سے آنکھ ملا پاتا۔ مگر دن گزرے تو ایک شب اس نے مجھے چھونا چاہا۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ میں علی سے والہانہ محبت کرتی تھی۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے وہ میرے ساتھ ہر پل رہا کرتا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ میں اسے معاف کردوں گی۔ پر۔۔۔؟''

ایک مرتبہ پھر گہری خاموشی ہمارے درمیان اپنا رول ادا کرنے لگی تھی۔ میں کب تک سامع بنا سنتا رہتا۔ میں نے لبوں کو جنبش دی: ''پھر؟۔۔۔پھر کیا ہوا؟''
''ہونا کیا تھا؟ علی نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھر کر پیار کرنا چاہا تو میں نے جھٹکا دے کر خود کو اس کے مضبوط بازووں سے آزاد کرلیا۔ اور تلخ ہوکر کہا۔ اپنے ناپاک ہاتھوں سے مجھے چھونے کی کوشش مت کرو۔۔۔ تمہارے بدن میں اب مجھے ڈیوڈ کا بدن بھی شامل نظر آتا ہے۔۔۔ میں ایک ہی وقت میں دو مردوں کے ساتھ بستر میں نہیں جاسکتی۔''
علی بے چہرہ ہوکر رہ گیا تھا اور مٹھیاں ملنے لگا تھا۔ لیکن کمرے سے چلتے وقت اس نے یہ ضرور کہا تھا کہ وہ جس قدر محبت مجھ سے کرتا ہے، اس قدر ڈیوڈ سے بھی کرتا ہے۔ اور اس کا دل دونوں کے واسطے ایک سابٹا ہوا ہے۔ اس پر میں بھڑک اٹھی تھی کہ اگر وہ ڈیوڈ کے واسطے دل میں جگہ رکھتا تھا تو مجھ سے شادی کیوں کی؟ میری زندگی برباد کیوں کی؟ مگر اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔''
آنسو اس کی آنکھوں سے لڑھک کر اس کے گالوں کو چھوتے ہوئے، اس کی گردن پر پھیل رہے تھے۔ سسکیاں بھی کمرے میں ابھر آئی تھیں۔ میرا نشہ بھی اس شام ہرن ہوا جارہا تھا۔ میں نے اپنی کرسی اس کی کرسی سے جوڑ دی اور میرا ہاتھ اس کی پشت پر پھیل کر اس کی کمر کو برابر سہلاتا رہا۔ لیکن ڈھارس دینے کے باوجود اس کا ذاتی اعتماد بحال نہ ہو پایا۔ آنسو جاری رہے اور سسکیاں بھی۔ میں نے دھیرے سے اس کا بدن اپنے بالکل قریب کرلیا۔ اس کا سر میرے سینے میں گم ہوکر رہ گیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ میرے ہونٹ اس کی پیشانی کو چھو کر اس کے ہونٹوں میں پیوست ہوگئے۔ اس نے پھر بھی کوئی مزاحمت نہ کی۔ میں نے اسے کرسی سے اٹھا کر خود سے چپکا لیا اور وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ مجھ میں دھنستی چلی گئی۔
وہ یادگار رات ہم نے اکٹھے بسر کی۔ روشن چاندرات بھر مسکراتا رہا۔
منہ اندھیرے پرندے چہچہائے تو میری آنکھ کھل گئی۔ ان کی بھانت بھانت کی بولیاں کانوں کو نہایت بھلی لگیں۔ میری بغل میں دراز سلمہ آرزو بے خبر سو رہی تھی۔ چہرے پر سکون اور ہونٹوں پر طمانیت کی باریک سی لکیر لیے ہوئے۔ میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھا۔ میرا روم روم

سلمہ کے بدن کی صندلی خوشبو سے سرشار تھا۔ میں اپنے مقدر پر حیران بھی تھا کہ یہ سلسلہ اچانک کیسے چل نکلا ہے؟ کمرے میں سرمئی اجالا اور چھپئی اندھیرا مدغم ہو رہے تھے۔ خیال آیا کہ مجھے اسی وقت یہاں سے چل دینا چاہئے، ورنہ صبح کے پھیلتے اجالے میں اگر کسی لاجر نے مجھ کو سلمہ کے کمرے سے نکلتے دیکھ لیا تو سلمہ کی رسوائی مجھ سے زیادہ ہوگی۔ اور یہ خبر مکان کی نچلی منزل سے اوپری منزل تک گشت کرتی پھرے گی؟ نشاط خان مفت میں میرا دشمن بن کر رہ جائے گا؟ پھر کسی پٹھان کی دشمنی اکثر خطرناک ثابت ہوا کرتی ہے۔ میں چپکے سے اٹھا کپڑے پہنے اور دبے پانو کمرے سے چلا آیا۔

سلمہ آرزو نئی جگہ پر منتقل ہوگئی۔ مگر نشاط خان کے مکان کو آخری سلام کرتے وقت اس نے ایک مختصر سا رقعہ تحریر کیا اور اسے میرے کمرے میں چھوڑ کر چلی گئی۔ لکھا تھا۔

اس رات ہمارے درمیان جو بھی ہوا، وہ غلط تھا۔۔۔ آئندہ ہم ضرور ملیں گے۔ مگر دوستوں کی طرح، بس۔ سلمہ۔

رُقعے میں لکھے ہوئے چند جملوں نے مجھ پر عجیب سا تأثر چھوڑا تھا۔ میں گمان بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ سلسلہ جو سلمہ کے ساتھ غیر متوقع طور پر اچانک شروع ہوا تھا، اچانک ہی ختم ہوکر رہ جائے گا۔ جبکہ میں تو اس خیال میں تھا کہ میں اور سلمہ زندگی کا سفر دور دور تک اکٹھے طے کریں گے، پھر کسی موڑ پر سر جوڑ کر سوچیں گے کہ باقی ماندہ زندگی ہمیں کس ڈھنگ سے بسر کرنی ہے؟ مگر اب؟ سبھی خواب گردکی نذر ہوگئے تھے۔

سلمہ آرزو کا دباؤ اپنے سالی سیٹر (وکیل) پر برابر جاری تھا کہ وہ اسے جلد سے جلد طلاق دلوادے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ قانون اس کے حق میں سرے سے نہیں ہے۔ اس کا شوہر اگر رضامندی کا اظہار نہ کرے تو وہ پانچ برسوں تک اس کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتی۔ اس کا وکیل علی بیگ کے وکیل کو اکثر لکھا کرتا تھا کہ چونکہ پارٹیاں اب ساتھ رہنا پسند نہیں کرتیں اور ان کے درمیان اختلافات بھی حد سے زیادہ بڑھ چکے ہیں۔ لہذا ان حالات میں دونوں فریق کی بہتری اسی میں ہیں کہ وہ باہمی طور پر طلاق کی خاطر مان جائیں۔ اس صورت میں طلاق مقررہ میعاد سے پہلے کسی وقت بھی ممکن

ہے۔ بعد ازاں سابق میاں بیوی اپنی اپنی نئی زندگی کا آغاز بآسانی کر پائیں گے۔ مگر علی بیگ وکیل کا وہ خط پڑھ کر اُس کے پُرزے پُرزے کر ڈالتا۔ اس کا مردانہ وقار سلمہ کے چھوڑ جانے پر سخت مجروح ہوا تھا۔ وہ انتقام چاہتا تھا۔ سلمہ کو تڑپا تڑپا کر اس کی راتوں کی نیند حرام کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی زخمی انا کو یہاں تک مسئلہ بنالیا تھا کہ وہ کسی بھی شئے کو صحیح تناظر میں دیکھنے کا اہل نہ رہا تھا۔

سلمہ کے کمرے میں کارنس پر رکھی ہوئی علی بیگ کی تصویر کو دیکھ کر میں نے واقعی اسے سلمہ کے کمرے میں بیٹھا ہوا پایا۔ کھلتا رنگ، بلوری آنکھیں، کالے لمبے بال اور تیکھے نین نقش۔ ساتھ والی فریم میں وہ سلمہ کے ساتھ کھڑا تھا۔ مضبوط اور دراز قد۔ سلمہ اس کی بغل میں نگاہیں جھکائے کھڑی تھی۔ یہ ان کی شادی خانہ آبادی کی یادگار تصویر تھی اور دونوں گُل پوش تھے۔ تصویریں نیم کشادہ کمرے کی سنہری کارنس پر رکھی تھیں اور میں سلمہ کے نازک ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے چسکی بھر کر پیالہ میز پر رکھا اور گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ایکٹن پارک کا سبزہ تا حدِ نظر پھیلا ہوا تھا۔ اونچے اونچے پیڑ بھی قطار در قطار کھڑے تھے۔ منظر بڑا حسین تھا۔ ہم دونوں اس میں کھو سے گئے۔ سلمہ نے یقیناً اپنے قیام کی خاطر بہتر جگہ تلاش کر لی تھی۔ اور نشاط خان جیسے شخص کی للچائی شخصیت اور بھوکی نگاہوں سے بچ نکلی تھی۔

گردن موڑ کر جب میری نظر تصویروں پر پھر سے پڑی تو میں نے دریافت کیا:

''تمہیں تو اب طلاق کا انتظار ہے۔۔۔ پھر تم نے یہ تصویریں اپنے بستر سے پانچ فٹ کے فاصلے پر سجا کر کیوں رکھی ہیں؟''

''یہ میرا ماضی ہے۔ اور آدمی اس سے الگ نہیں ہو پاتا۔''

''مگر یہ تصویریں تم کو پریشان نہیں کرتیں؟''

''بالکل نہیں۔ یہ ایک PHASE تھا، جو گزر گیا اور اب ختم ہو چکا ہے۔۔۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان تصویروں میں وہ مسکراتا ہوا شخص میری زندگی میں پہلا آدمی تھا اور میرا پہلا پیار بھی۔''

''اور اب۔۔۔؟''

وہ مسکرادی، کچھ یوں کہ میں دنیا کے بعض معاملات میں تجربہ اور مشاہدہ اس سے کم رکھتا ہوں اور اب ایک بونے کی حیثیت سے اس کے سامنے دوزانو ہوں۔

''جیتندر، میں نے تمہاری صرف ایک ہی کہانی پڑھی ہے۔ میں تم کو ایک اچھا ادیب بھی مانتی ہوں۔ پر عورت اور مرد کے دل، نظر، سوچ اور جذبات میں سدا سے فرق رہا ہے۔ ان کی جسمانی کیمسٹری (CHEMISTRY) بھی الگ رہی ہے۔ اگر تم نے اس سچ کو جان لیا ہوتا تو پھر یہ سوال مجھ سے نہ پوچھا ہوتا؟''

اس نے چاروں شانے مجھے چت کر ڈالا تھا اور میں کہیں کا نہیں رہا تھا۔ لیکن میں بھی میدان چھوڑنے والوں میں سے نہیں تھا۔ بزرگوں کا کہا میرے کام آیا اور میں نے اسے اشارہ کرنا ضروری سمجھا:

''مانا کہ عورت ذات کی سوچ، جذبات اور اس کی نظر سے مَیں زیادہ واقف نہیں ہوں۔ مگر اُس کے دل سے خوب واقف ہوں۔''

اس نے جواب طلب نظروں سے دیکھ کر وضاحت چاہی۔

''ہمارے شاستروں میں لکھا ہے کہ ناری کا من ساگر سے بھی گہرا ہے۔ اس کی اتھاہ پانا ممکن نہیں اور اس کی بدلتی نظر، سوچ اور جذبات اس کے من سے ہی جڑے ہوتے ہیں۔''

یہ سننا تھا کہ وہ اٹھ کر کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرنے لگی اور دیر تک میری طرف پُشت کیے کھڑی رہی میرا انتظار برقرار رہا کہ وہ پلٹ کر مجھ سے کچھ نہ کچھ ضرور کہے گی۔ مگر بے سود۔ ایسا لگا کہ یگ بیت گئے ہیں اور وہ پلٹ کر مجھے کبھی نہ دیکھے گی۔

مایوس ہو کر جب میں اس کے ہوسٹل سے نکل کر بس اسٹاپ پر آن کھڑا ہوا تو مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ آئندہ میں سلمہ آرزو سے شاید ہی مل پاؤں گا۔ لیکن میرا سوچنا غلط ثابت ہوا۔ سلمہ کے فون برابر آتے رہے۔ میں بھی شاذونادر اس کو فون کر لیا کرتا تھا۔ درحقیقت میرے کام کے اوقات ہی کچھ ایسے تھے کہ میں رات کا پنچھی بن چکا تھا۔ ویک اینڈ پر ہی ملاقات ممکن تھی۔ لیکن ہمارے درمیان سرسری اور بھرپور ملاقاتیں جاری رہیں۔ دو تین فلمیں بھی ہم نے اکٹھی دیکھیں۔ سڑک

پر چلتے ہوئے وہ کبھی کبھار میرا بازو مغربی عورتوں کے انداز میں تھام لیا کرتی تھی۔ خوشی سے مجھ کو احساس ہوتا کہ راہگیر یقیناً ہم کو میاں بیوی تصور کر رہے ہوں گے، نہیں تو وہ ہمیں والہانہ عشق میں گرفتار عاشق معشوق ضرور سمجھ رہے ہوں گے۔ مگر سلمہ نے وہ گہری لکیر جو اپنے اور میرے درمیان کھینچ رکھی تھی، وہ اپنی جگہ قائم و دائم تھی۔ جبکہ میں کسی بھی وقت سلمہ کا ہلکا سا اشارہ پا کر اسے عبور کرنے کو تیار تھا۔ سلمہ کو بھی اس حقیقت کا احساس تھا۔ مگر وہ اپنی جگہ چٹان پہ بنی رہی۔

ایک ویک اینڈ کی پہلی صبح کو کام سے فارغ ہو کر میں نے سُپر مارکیٹ سے دس پندرہ روز کا راشن خریدا اور اسے تھیلیوں میں بھر کر گھر پہنچا۔ دس ساڑھے دس بجے کا وقت تھا۔ میری آہٹ پا کر نشاط خان اپنے کمرے سے باہر چلا آیا۔ علیک سلیک کے بعد گویا ہوا: ''یار سنگھ۔۔۔ سلمہ بی بی کا فون آیا تھا؟''

''کوئی سندیش؟''

''کیا؟''

''میرا مطلب ہے، کوئی پیغام؟''

''فون کرنے کو بولا ہے۔''

''ٹھیک'' کہہ کر میں نے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ خان کی آواز نے مجھ کو روک لیا۔

''سنگھ، تجھ کو علم ہے، وہ حور پری کہاں رہتی ہے؟''

''ہاں۔''

''اس کا فون نمبر بھی تیرے پاس ہوگا؟''

''ہاں ہے۔''

''یار مجھے اس کا فون نمبر دے دے۔''

''نہیں۔''

''تو پھر اس کا پتہ ہی دے ڈال؟''

''نہیں۔ بالکل نہیں۔''

اس نے خونخوار نظروں سے مجھ کو دیکھا، گویا جلد ہی کوئی خونی واردات جنم لینے والی ہو اور قالین خون سے لت پت ہو جائے گا۔ میں نے بھی ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھیلے قالین پر گرا دیئے۔ اور جیکٹ کے بٹن کھول کر اور اس کے بازو چڑھا کر لڑنے بھڑنے کو تیار ہو گیا۔ خان میرے بدلتے ہوئے جلالی تیور دیکھ کر ہدک سا گیا۔ اس کا لہجہ، رویہ اور لفظوں کا اتار چڑھاؤ بھی بدل گیا۔ بولا: ''یار سنگھ ہمیں کیا لینا دینا اس حرافہ سے۔ سالی جائے بھاڑ میں۔ ہم کیوں لڑیں اُس اُلو کی پٹھی کی خاطر۔''

ایک بار تو دل میں آیا کہ خان بہادر کے چہرے پر اپنے مضبوط ہاتھوں سے ''س ل م ا'' لکھ ڈالوں۔ مگر میں نے ضبط سے کام لیا اور تھیلے اٹھا کر اپنی منزل کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے سلمہ آرزو کی صحبت میں کئی حسین اور رنگین شامیں گزاری تھیں۔ مگر اس شام کے رنگ، اتار چڑھاؤ اور تیور ہی الگ تھے جو بھلائے نہیں بھولتے۔ ہم سوہو (SOHO) کے علاقے چائنا ٹاؤن کے ایک ریسٹورنٹ گولڈن ڈریگن میں ڈِنر کر رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے ہم کارل مارکس کی قیام گاہ، واقع ڈین اسٹریٹ کی زیارت کر کے لوٹے تھے۔ اس کی دست نگر، تنگ دست زندگی اور اس کے ''داس کیپٹل'' کے متعلق باتیں کرتے کرتے ہم نے ریسٹورنٹ کا مینو تک دیکھ ڈالا اور کھانے کا آرڈر بھی دے دیا تھا۔ باہر آکاش سے برف ہولے ہولے اتر رہی تھی۔ سفید گالے زمین پر بچھ رہے تھے۔ سلمہ اس شام زیادہ ہی خاموش تھی۔ زیادہ تر میں ہی بول رہا تھا۔ وہ گفتگو میں حصہ ضرور لے رہی تھی۔ لیکن بولتے بولتے اچانک کہیں دور نکل جایا کرتی اور چلتے چلتے اچانک رک بھی جایا کرتی۔ مجھے وجدان سا ہوا کہ ہو نہ ہو آج شام اس کے ذہن پر دباؤ بہت زیادہ ہے اور کہنے کو اس کے پاس بہت کچھ ہے۔ صرف اس کو صحیح وقت اور صحیح موقع کا انتظار ہے۔ وائن کے گلاس ٹکراتے ہی وہ بول اٹھی اور میرے محسوسات صحیح ثابت ہوئے۔

''کل علی بیگ کا فون آیا تھا؟''

''اچھا؟ کیا کہا اس نے؟''

''وہ طلاق دینے کو تیار ہے۔''

''تو پھر تم اتنی دیر سے خاموش کیوں ہو؟ پہلے بتایا ہوتا؟
''مگر اس نے ایک شرط رکھی ہے؟''
''کیا؟''
''اس کا کہنا ہے کہ اگر میں اس کی شرط قبول کرلوں تو وہ اگلے روز ہی اپنے وکیل کو طلاق کے کاغذات کورٹ میں داخل کرانے کو بول دے گا۔''
''مگر شرط کیا ہے؟''
''اس میں علی بیگ کی مردانہ انا اور ناپاک خصلت چھپی ہوئی ہے''
''تم گھما پھرا کر باتیں کیے جارہی ہو۔ صاف صاف بتاؤ نا؟''
اس کے سینے پر بوجھ یقیناً حاوی تھا۔ اس نے گلاس اٹھا کر چند گھونٹ بھرے۔ خود کو جمع کیا۔ پھر میری آنکھوں میں براہ راست اتر گئی۔ میں حیران رہ گیا۔ اس نے آج تک مجھ کو اپنائیت سے کبھی یوں دیکھا نہ تھا۔ پورا وشواس، بھروسہ اور اپنا پن۔ انتہائی کربناک انداز میں گویا ہوئی:
''علی بیگ چاہتا ہے کہ ایک رات میں اس کے ساتھ بسر کروں۔ وہ اس رات کو میرے بدن کا مالک ہوگا۔۔۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق اس کا استعمال کرے گا۔ اور میں انکار نہیں کروں گی۔''
یہ سننا تھا کہ میں فریز ہوگیا۔ لیکن میں نے دل ہی دل میں علی بیگ کو ہزاروں گالیاں دے ڈالیں۔ صرف اسے ہی نہیں۔ پوری مرد ذات میری لپیٹ میں آچکی تھی۔ میرے چہرے پر لگی ہوئی آگ سے سلمہ کو میرے اندرون کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ لیکن میں صرف پریشان ہی نہیں، حد درجہ اکھڑ بھی چکا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ مرد ذات کو اس کرہ ارض سے فنا ہی کر ڈالوں۔ وہ برابر میرا ہاتھ سہلا کر میرا غصہ کم کرنا چاہ رہی تھی۔ پھر اس نے جھک کر اپنے لب میرے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیئے۔ بے ساختہ میں پوچھ بیٹھا:
''تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟''
غالباً اس کے دل کا بوجھ قدرے کم ہو چکا تھا۔ قدرے تحمل سے بولی:
''یہ کھیل محبت، ضمیر اور انا کا ہے۔ دیکھو جیت کس کی ہوتی ہے؟''

اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ کھانا ختم ہوا تو ہمیشہ کی طرح ہم نے بل چکانے کو نِصف نِصف رقم ادا کرنا چاہی۔ مگر اس نے میرا حصہ قبول کرنے سے صاف انکار کردیا۔ اور میرے اصرار کے باوجود میرا ہاتھ جھٹک ڈالا۔ پھر بل ادا کر کے اس نے ویٹرس کو موٹی سی ٹپ بھی دی۔ ریسٹورنٹ سے نکلنے پر اس نے میرا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔ ٹیوب کے سفر کے دوران بھی اس نے میرا ہاتھ تھامے رکھا اور میرے شانے پر سر رکھے آنکھیں موندے گہری سوچ میں ڈوبی رہی۔ کبھی کوئی جذباتی نکتہ اپنا دباؤ بڑھادیتا تو وہ کپکپا کر میرا ہاتھ زور سے دبا ڈالتی۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ اس وقت وہ بھری دنیا میں خود کو یکسر تنہا پا رہی ہے۔ گو کہ میں اس کے ساتھ تھا۔ لیکن ہمارا رشتہ بھی عجب نوعیت کا تھا۔ اس قدر نزدیکی پھر بھی کس قدر دوری؟ ظاہر ہے کہ اس کے دماغ میں ہلچل بپا تھی۔ کوئی بھی فیصلہ کرنا اس کے واسطے آسان نہ تھا۔ لیکن میرا جی کر رہا تھا کہ بھری ٹیوب میں اسے چوم کر اپنے ہونے کا احساس دلاؤں۔

اس رات جب میں سلمہ کو چھوڑنے اس کے ہوسٹل کے بیرونی گیٹ پر پہونچا تو وہ صدر داخلے کی طرف بڑھنے سے پہلے مجھ سے قریب قریب لپٹ سی گئی اور چند پل اسی کیفیت میں کھڑی رہی۔ پھر ایک زخمی کراہ اس کے گلے سے نکلی: ''کاش میں نے شادی نہ کی ہوتی ۔۔۔ تقدیر نے میرا مذاق اڑایا ہے۔ دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے مجھ کو؟''

''میری اچھی سلمہ، تم پریشان ہو۔۔۔ اِس سمے تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔۔۔ کل پرسوں بات کریں گے۔ شب بخیر۔''

تین روز بیت گئے۔ لیکن سلمہ کی طرف سے کوئی فون، کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی تو میرا فکرمند ہونا لازم تھا۔ الٹے سیدھے خیالات دماغ سے گزرتے رہے۔ ایک شام فیکٹری میں اپنے پلانٹ پر جانے سے پہلے میں نے سلمہ کو فون کیا۔ ہوسٹل کی فلور لیڈی کے بول سُن کر میرے کانوں کے پردے بند ہونے لگے۔ اس نے بتایا کہ مسز سلمہ آرزو بیگ آج صبح ہوسٹل چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ مگر کہاں؟ وہ کوئی علم نہیں رکھتی۔ میں فریز ہوگیا۔ اس رات کام کاج کے دوران میرا دل رتی بھر نہ لگا میں اپنے رفیق کاروں کے ساتھ بھی اکھڑا اکھڑا سا رہا۔ مجھے فکر لاحق ہوگئی تھی کہ سلمہ کوئی الٹا

سیدھا قدم نہ اٹھائے ؟ گو کہ اس کی امید کم تھی ۔ اس لیے کہ وہ توانا اور متوازن ذہن رکھتی تھی ۔ خیر و شر میں تمیز کرنا اس کے نزدیک معمولی بات تھی ۔ پھر وہ آزادانہ طبیعت بھی رکھتی تھی ۔ اگلی صبح فیکٹری سے فارغ ہو کر میں نے سلمہ کو انشورنس کمپنی میں فون کیا، جہاں وہ ملازم تھی ۔ پتہ چلا کہ وہ گذشتہ تین روز سے کام پر حاضر نہیں ہوئی اور نہ ہی اس نے کوئی سک نوٹ (SICKNOTE) بھیجا ہے ۔ میں نے اپنا نام اور فون نمبر آپریٹر کے پاس چھوڑے کہ سلمہ کام پر حاضر ہوتے ہی مجھ سے رابطہ کرے کہ یہ نہایت ضروری ہے ۔ لیکن اس سنسار کے ہر مہانگر میں دن رات پنکھ لگا کر اڑا کرتے ہیں ۔ ماہ و سال کا احساس بھی جاتا رہتا ہے اور آدمی دل برداشتہ ہو کر رہ جاتا ہے ۔ سلمہ نے کوئی بھی سراغ نہ چھوڑا تھا کہ وہ کس جہاں میں کھو گئی ہے ۔ میں اسے تلاش کرتے کرتے تھک سا گیا تھا اور پریشان اتنا ہوا تھا کہ بس خدا کی پناہ ۔ رہ رہ کر یہی خیال آتا کہ سلمہ آرزو ماضی کی ایک حسین ، رنگین اور سنگین یاد بن کر رہ گئی ہے ۔ اس سے ملنا تو درکنار، اسے دیکھنا بھی شاید ہی نصیب ہو؟ اسے اگر میرا ذرا بھی خیال ہوتا تو وہ مجھے اپنے فیصلے اور نئے ٹھکانے سے آگاہ ضرور کرتی ؟ لیکن میں اس کا ہوتا بھی کون تھا کہ وہ اپنا نجی فیصلہ مجھ کو سناتی ؟ چند ماہ کی رفاقت ہی تو تھی بیگانگی ، اپنائیت میں کیونکر بدلتی ؟ ممکن ہے مذہبی اور ملکی دیواریں اٹھ گئی ہوں؟ مگر یہ خیال آتے ہی مجھے شرمندگی ہوئی کہ سلمہ تو کھلا ذہن رکھتی تھی اور ہر طرح کے مذہبی بھید بھاؤ سے پاک تھی ۔

برسوں پہلے کے واقعات اور حالات کو من ہی من اور ذہن ہی ذہن میں دہرا کر میں جذباتی ہو چلا تھا ۔ میرا وجود دھند میں کھو سا گیا تھا ۔ مگر کچھ دیر میں دھند چھٹ گئی تو وہ تمام اچھے بُرے کردار مجھے یاد آنے لگے ۔ جن کے ساتھ گزرے ایام میں میں نے اپنے جیون کا انمول وقت گزارا تھا ۔ میں دریا کے مٹیالے پانی سے نگاہیں اٹھا کر واپس لوٹ آیا ۔ ریلینگ سے پلٹ کر میں نے سلمہ آرزو کو دیکھا ۔ وہ اپنی جگہ پر جوں کی توں بیٹھی ہوئی تھی ۔ لیکن اب وہ کتاب نہیں پڑھ رہی تھی ۔ بلکہ اسی بینچ پر بیٹھے ہوئے کسی مرد سے مسکرا کر باتیں کر رہی تھی ۔ وہ شخص درمیانی عمر کا تھا اور وہ بینچ کے دوسرے سرے پر بیٹھا اسے بڑی چاہت سے دیکھ رہا تھا ۔ وہ اپنے لمبے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا، مگر اس کا سر درمیان سے بالکل صاف تھا ۔ وہ دراز قد اور مضبوط بدن کا مالک تھا اور گندمی مائل

رنگ رکھتا تھا۔ ان دونوں کے درمیان تین چار سال کی ایک چنچل سی بچی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سلمہ کے بدن سے چپکی ہوئی تھی۔ وہ بھی بچی کو لاڈ پیار کر رہی تھی۔ پھر وہ تینوں اچانک اس بینچ سے اٹھ بیٹھے۔ بچی نے دونوں کا ہاتھ پکڑ کر ان کے درمیان اُچک اُچک کر قدم رکھنا شروع کر دیا۔ سلمہ اور وہ شخص مسکراتے بھی رہے اور ہلکے ہلکے ہنستے بھی رہے۔ پھر وہ تینوں میرے بہت قریب سے گزرے۔ مرد نے سرسری طور پر مجھ کو دیکھا اور سلمہ نے بھی۔ مگر اس نے مجھ کو کسی بھی طور نہ پہچانا۔ ابھی وہ لوگ ایک دو قدم آگے بڑھے ہی تھی کہ سلمہ نے پلٹ کر مجھ کو دوبارہ دیکھا۔ مگر اس مرتبہ بھی اس کے چہرے پر میری پہچان کا کوئی نقش نہ ابھرا اور نہ ہی اس کے پیروں میں کوئی رکاوٹ آئی میں انہیں ریلینگ کے ساتھ ساتھ جاتے ہوئے تب تک دیکھتا رہا۔ جب تک کہ وہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ لیکن میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ شخص جو سلمہ کے ہمراہ تھا، وہ اس کا سابق شوہر علی بیگ تھا یا کوئی نیا شوہر؟ یا نیا عاشق؟ لیکن میرا دل بار بار مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ہو نہ ہو وہ آدمی علی بیگ ہی تھا۔

☆☆

پہلا گُناہ

ان دنوں میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا اور امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں ابھی سترہ برس کی عمر کو پوری طرح سے نہ پہنچا تھا، چار پانچ ماہ باقی تھے۔ لیکن مجھے ہر دم یہ احساس رہنے لگا تھا کہ میں پورا بالغ ہو چکا ہوں۔ دن میں اگر کوئی ہوشربا بدن دِکھ جاتا تو وہ گھنٹوں میرے ساتھ رہتا اور رات میں نیند بھی حرام ہو جاتی۔ بدن میں دوڑتا گرم خون الگ سے پریشان کرتا۔ یوں تو سالانہ امتحان شروع ہونے میں تین چار ماہ کا وقفہ تھا لیکن میں دن رات نصابی کتابوں میں اس غرض سے کھویا رہتا کہ کہیں دوبارہ فیل ہو کر نہ رہ جاؤں۔ گئے برس میں جن مضامین میں رہ گیا تھا، ان پر دل لگا کر محنت کر رہا تھا۔ حالانکہ کتابیں میرا مغز چاٹ رہی تھیں اور لہو الگ سے پی رہی تھیں۔ لیکن میں مجبور تھا۔ درحقیقت والد صاحب کا خوف مجھ پر بھوت بن کر سوار تھا۔ انھوں نے ماں جی کی موجودگی میں مجھے کھلے لفظوں میں نوٹس دے ڈالا تھا کہ اگر میں دوبارہ فیل ہوا تو وہ مجھ کو گھر سے نکال باہر کریں گے اور جائیداد سے بھی بے دخل کر دیں گے۔ لیکن میں کسی بھی طور خاندانی جائیداد سے محروم ہونا نہیں چاہتا تھا۔ دیگر مجھ کو یونیورسٹی میں جانے کا بھرپور لالچ بھی تھا۔

وہاں کا ماحول، لڑکیوں کی بھرمار، ان کی صحبت، دوستیاں، عشق اور گلے شکوے میرے نزدیک نہایت اہم تھے۔ والد صاحب نے میری سرگرمیوں پر ایک شیر کی مانند نظر رکھی ہوئی تھی۔ میں اسکول سے کب لوٹتا ہوں۔ شام میں کس کس دوست سے ملتا ہوں اور رات میں کتنے بجے پڑھ کر سوتا ہوں۔ لیکن ایک میں تھا کہ مجھ میں ان سے آنکھ ملانے کی ہمت رتی بھر نہ تھی۔ انھوں نے شخصیت ہی کچھ ایسی پائی تھی کہ بارعب شخص بھی ان کو دیکھ کر دب جائے۔ بلند قامت، دوہری پسلی کا مضبوط بدن، موٹی موٹی تیز ابی آنکھیں، چہرے پر سنجیدہ وقار اور بڑی بڑی لچھے دار مونچھیں۔ وہ اس قدر خوفناک تھیں کہ جب وہ ہاتھ میں چھڑی تھامے شام کو گھر سے تفریح کے لیے نکلتے تو گلی محلے میں کھیلتے کودتے بچے، کھیل چھوڑ کر الگ کھڑے ہو جاتے۔ گلی کے آوارہ کتے بھی ان کی جھلک پا کر بھونکنا بند کر دیتے اور گردن جھکائے، دُم ہلاتے ان کے قریب سے گزر جاتے۔ لیکن والد صاحب میں چند خوبیاں دیگر بھی تھیں۔ ان کا سماجی رُتبہ نہایت بلند تھا۔ برادری کا ہر فرد ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ وہ نو آبادیاتی دور میں درجہ اول کے مجسٹریٹ رہ چکے تھے۔ انھوں نے اپنے بھائی بندوں پر طرح طرح کے ستم ڈھا کر انگریزوں کو خوش رکھا تھا۔ انگریز سرکار نے بھی ان کی بڑھ چڑھ کر قدر کی تھی۔ آزادی سے ایک برس پہلے ان کو رائے صاحب کے خطاب کے ساتھ ایک حویلی بھی تحفتہً دے گئے تھے۔ وہ مغلیہ عہد کی قدیم مرمت شدہ حویلی تھی جو محض سولہ سترہ کمروں پر مشتمل تھی۔ میں وہیں پیدا ہوا تھا اور میری پرورش بھی وہیں ہوئی تھی۔ کئی بار میں بچپن میں ان کمروں میں کھو جایا کرتا۔ پھر ڈر کا مارا، ان بھول بھلیوں سے آزاد ہونے کی فکر میں رو رو کر ماں جی کو آوازیں دیتا۔ ان کے وارد ہونے پر ہی میری جان میں جان آتی اور مجھے لگتا کہ میں زندہ ہوں۔

اُن ہی دنوں حویلی میں ایک جوان لڑکی کام کاج کرنے کو وارد ہوئی۔ یوں تو گھر میں رام پور کا ایک عمر رسیدہ مسلمان خانساماں بھی تھا۔ لیکن اس لڑکی کے ذمہ اوپر کا کام کاج آیا تھا۔ اُس کا نام چمپا تھا اور اس کی عمر اُنیس بیس سے زیادہ نہ رہی ہوگی، مگر سمجھ بوجھ اپنی عمر سے زیادہ رکھتی تھی۔ درمیانہ قد، پھولا پھولا بدن، سانولا رنگ، ابھرے ہوئے گال، جن کے درمیان چھوٹی

سی چپٹی ناک اور گلے میں سونے کا ہار۔ وہ اس کے سانولائے بدن پر بڑا نکھرتا تھا۔ وہ اس کی ماں کی آخری نشانی تھی۔ مرتے وقت وہ اسے اپنی بیٹی کے گلے میں ڈال گئی تھی۔ چمپا ہر دم اُسے پہنے رکھتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ سوتے وقت بھی اسے خود سے الگ نہ کرتی۔ اکثر اُسے چوم کر کہا کرتی:

''کون کہتا ہے میری میا کا دیہانت ہوا گیا۔ وہ تو پل پل جیوت ہے میرے سنگ۔''

اُس کی ماں نے ہمارے خاندان کی بڑی خدمت کی تھی۔ وہ اس زمانے سے ہمارے ہاں کام کر رہی تھی جب میں نے ابھی ماں جی کی گود بھی نہ دیکھی تھی۔ میں اس کے ہاتھوں میں ہی کھیل کود کر بڑا ہوا تھا۔ وہ پیار سے مجھے کبھی منا، کبھی راج دلارا اور کبھی میرے چاند کہا کرتی۔ پھر اچانک ہی وہ بیمار پڑ گئی تھی۔ دلی شہر کو وبا نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہزاروں لوگ دنوں میں ہی ہیضے کا شکار ہو گئے تھے۔ ماں جی کے کہنے پر رائے صاحب نے اُس کا علاج بہترین ڈاکٹروں سے کروایا۔ مگر وہ جاں بر نہ ہو پائی۔ دمِ رخصت اس نے ماں جی کی ساڑھی کا پلو تھام کر اشکبار آنکھوں سے التجا کی تھی: ''کانتا بہن میری چمپا کو سنبھال لینا۔ ورنہ زمانہ اُسے خراب کر دے گا۔''

ماں جی بڑی جذباتی قسم کی عورت تھیں۔ پھر عورت ہی عورت کا دُکھ سمجھتی ہے اور اُس کی قدر بھی کرتی ہے۔ انھوں نے مرنے والی کی ہر بات مان لی اور اُسے یہ بھی یقین دلایا کہ وہ چمپا کا بیاہ اپنے ہاتھوں سے کریں گی۔ یہ سن کر چمپا کی ماں خوشی خوشی رخصت ہو گئی تھی اور اس کی بیٹی ہمارے یہاں چلی آئی تھی۔ اس نے حویلی میں قدم کیا رکھا، حویلی میں ایک انقلاب سا آ گیا۔ پہلا کام جو اُس نے انجام دیا وہ حویلی کی صاف صفائی تھی۔ اُس نے ہر کونا، ہر کمرہ اتنی چابکدستی سے سجایا سنوارا اور چمکایا کہ حویلی کا نقشہ ہی بدل کر رہ گیا۔ یہ نفاست یہ ہنر اُسے ورثے میں ملا تھا۔ وہ یقیناً اپنی ماں سے بازی لے گئی تھی۔ وہ سارا سارا دن کام میں جٹی رہتی اور اُس کی پیشانی پر شکن تک نہ اُبھرتی۔ منع کرنے کے باوجود وہ طرح طرح کے سالن بھی پکا دیتی، جو نہایت لذیذ اور ذائقے دار ہوا کرتے۔ ہر کوئی اُس کے پکوان کی تعریف کرتا۔ رائے صاحب تو کھاتے وقت انگلیاں بھی چاٹتے پھرتے اور خوش ہو کر کبھی اُسے چونی، کبھی اٹھنی اور کبھی روپیا انعام میں دیا کرتے۔

چمپا مقررہ وقت پر کھانا ہر کسی کے کمرے میں پہنچا دیا کرتی تھی۔ اُن دنوں ڈائننگ ٹیبل

پر اکٹھے بیٹھ کر کھانے کا چلن عام نہ تھا۔ البتہ ویک اینڈ پر پورا کنبہ ڈائننگ روم میں اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا کرتا تھا اور گھر کے نوکر چاکر ہاتھ باندھے کھڑے دِکھائی دیتے۔ یہ وہ دن تھے جب رائے صاحب کے دوست احباب اور سیاسی صلاح کار بیٹھک میں بیٹھے رات گئے دس دس گیارہ گیارہ بجے تک حالاتِ حاضرہ اور سماجی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا کرتے۔ وہ کانگریس پارٹی کے ٹکٹ پر اُمیدوار کی حیثیت سے اسمبلی کا چناؤ لڑنے کی سوچ رہے تھے اور پارٹی نے اُن کا پس منظر جان کر اُن کو نامزد بھی کر لیا تھا۔ اُن کے ہلکے سے اشارے پر چمپا چائے بنا کر اُن کی خدمت میں جُٹی رہتی۔ اُس نے رائے صاحب پر کچھ ایسا جادو کر دیا تھا کہ وہ اُسے اپنی بیٹی کی طرح چاہنے لگے تھے۔ وہ اُسے ڈبل روٹی کہہ کر پکارا کرتے۔ وہ واقعی ڈبل روٹی کی طرح پھولی ہوئی تھی۔ اُس کا بدن اکثر بلاؤز میں پھنسا پھنسا نظر آتا۔ وہ دنوں میں ہی پریوار کے ہر فرد سے گھل مل گئی تھی، کچھ یوں کہ وہ مُدت مدید سے میرے والدین کے علاوہ میرے بڑے بھائی اور بڑی بہن کو بھی قریب سے جانتی ہو۔ لیکن جہاں تک میرا سوال تھا، وہ مجھ کو ذرا بھی پسند نہ تھی اور ایک آنکھ نہ بھایا کرتی۔ میں نے کئی بار اُسے ڈانٹا بھی تھا اور ماں جی سے بے جا شکایتیں بھی کی تھیں۔ لیکن وہ میری ہر شکایت کو صرفِ نظر کیے سمجھایا کرتیں۔

"سنو چھوٹے...... چمپا یتیم لڑکی ہے۔ اُس کے آگے پیچھے اب کوئی نہیں رہا۔ ایک ماموں ضرور ہے۔ مگر وہ شرابی کبابی ہے۔ لڑکی کو بیچ کھائے گا۔ پھر یہ لڑکی ہمیں ہر سُکھ دے رہی ہے۔ میرا شریر بھی داب دیتی ہے۔ سیوا الگ سے کرتی ہے۔ تو اُس سے بیر مت رکھا کر؟"

مگر میرے دل میں جو نفرت اُس کے واسطے موجود تھی وہ کسی بھی طور کم ہونے میں نہ آتی۔ کئی بار میں نے خود سے جاننا بھی چاہا کہ مجھے اُس غریب سے نفرت کیوں ہے؟ مگر کوئی معقول جواب نہ ملا کرتا اور نہ ہی کوئی سرا میرے ہاتھ لگتا۔ لہٰذا میرے دل میں جو نفرت اُس کے واسطے پل رہی تھی وہ جوان ہوتی رہی۔

اپنی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی میں نے پر پُرزے نکالنے شروع کر دیے تھے۔ مجھے دنیا کی رنگینیاں اپنی طرف کھینچا کرتیں۔ خاص طور پر عورت کا دلکش بدن، جس سے لپٹنے کو میرا

من والہانہ چاہتا۔ پھر میں بچپن اور لڑکپن سے ہی شاہ خرچ واقع ہوا تھا۔ مجھ کو فضول خرچی کی پرانی لت بھی تھی۔ میں اپنی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر خرچ کرنے والوں میں سے تھا۔ مجھے رائے صاحب سے جو ماہانہ خرچ ملا کرتا تھا، وہ دنوں میں ہی کھانے پینے، ریسٹورنٹ، سگریٹ نوشی اور دوستوں کی تواضع کی نذر ہو جاتا۔ میرے دوست میری جان تھے۔ وہ میری تعریف کرتے نہ تھکتے کہ میں صحیح معنوں میں اُن کا ہمدرد ہوں اور قدر دان بھی۔ اونچ نیچ میں ذرا بھی یقین نہیں رکھتا اور دل کھول کر ان پر خرچ کرتا ہوں۔ میرا سینہ گز بھر کا ہو جاتا اور اگلے روز بھی میں اُن پر مہربان رہتا۔ لیکن جیب خالی ہو جانے پر میں محتاج بنا اِدھر اُدھر بغلیں جھانکتا پھرتا۔ پھر کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر ماں جی کی چوکھٹ پہ حاضر ہو جاتا۔ ممتا کی ماری ماں انکار تو نہ کرتی مگر کوستی جی بھر کے:

''چھوٹے تو بڑا اخر چیلا ہو گیا ہے..... رائے صاحب کو پتہ چل گیا تو میں ڈرتی ہوں، خواب گاہ میں دیوار پر لٹکتی بندوق نیچے نہ اُتر آئے۔ تؤ اُن کا غصہ تو جانتا ہی ہے؟ تیری ہڈی پسلی ایک کر دیں گے۔ میں بھی نہ بچا پاؤں گی۔''

لیکن مجھ پر ماں جی کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ مجھے دوستوں کی سنگت زیادہ عزیز تھی۔ میرا من ان سے ملنے کو تڑپا کرتا اور میں شام کا بے صبری سے انتظار کرتا۔

ایک شام میں بن ٹھن کر دوستوں سے ملنے جا رہا تھا کہ چمپا اپنے گول مٹول چہرے پر مسکراہٹ لیے، ہاتھوں میں چائے کا پیالہ اور پلیٹ میں بسکٹ رکھے کمرے میں داخل ہوئی اور سدا کی طرح دونوں چیزیں میز پر رکھ دیں۔ میں سدا کی طرح اس انتظار میں تھا کہ وہ اپنی ڈیوٹی بجا کر چل دے گی۔ مگر وہ وہیں کھڑی رہی۔ میں نے چائے کے دو تین گھونٹ بھرے، ایک بسکٹ بھی کھا لیا۔ مگر اس کے قدموں میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ پھر اس نے اپنا سر پلو سے ڈھانپ کر مجھ کو اس انداز سے دیکھا، گویا وہ عرصے سے مجھ کو قریب سے جانتی ہو۔ پیار سے بولی:

''چھوٹے بابو..... مجھے کہنے کا ادھیکار تو ناہی..... پر تم کی فضول خرچی کی عادت بہت بُری ہے ..... میا بتا رہی تھیں..... پھر بابو جی کا غصہ تو بہت ٹھہرا..... پیسہ برباد کرنا ٹھیک تو ناہی؟''

یہ سننا تھا کہ میں بھڑک اُٹھا۔

''تم کون ہوتی ہو مجھ کو یہ سب کہنے والی؟........یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔''

''میں تو تورے بھلے کو کہہ رہی تھی۔''

''میں اپنا بُرا بھلا خوب سمجھتا ہوں۔تم اپنی نصیحت اپنے پاس رکھو۔ پھر کہا تو چوٹی کاٹ کر ہاتھ میں پکڑا دوں گا۔ سمجھی......جاؤ اپنا کام کرو۔''

اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ وہ پلّو سے آنکھیں صاف کرتی، گردن جھکائے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ مگر چوکھٹ پار کرنے سے پہلے پلٹ کر مجھے یوں دیکھا گویا جو بھی اُس نے کہا تھا وہ اپنی جگہ بالکل صحیح تھا اور میرا کہا بالکل غلط اور میں وقت کے ساتھ اپنے کہے پر پچھتاؤں گا۔

سانجھ ڈھلنے پر جب وہ کھانا لیے میرے کمرے میں وارد ہوا کرتی تو میں کتاب کو ایک طرف پھینک کر کھانے پر تیزی سے ٹوٹ پڑتا، جیسے کئی دنوں کا بھوکا ہوں۔ وہ جبر کے باوجود میری حرکات پر مسکرا دیتی اور کبھی اس کی ہنسی فضا میں ابھر آتی۔ مجھے اس پر رہ رہ کر غصہ آتا اور جب میں خشمگیں نظروں سے اس کا نظارہ کرتا تو وہ ہونٹوں پر پلّو رکھے اپنی مسکراہٹ کو چھپائے کمرے سے چل دیتی۔ مجھ کو کھانا پروسنے کے بعد وہ ٹرے میں پلیٹیں سجائے، بڑے بھائی صاحب کے کمرے میں جایا کرتی۔ وہ بی اے انگلش آنرز کا امتحان دینے کی تیاری کر رہے تھے اور فارن سروس میں جانے کی سوچ رہے تھے۔ ان کا ڈیل ڈول رائے صاحب پر گیا تھا۔ انتہائی پُر وقار شخصیت پائی تھی انھوں نے۔ نہایت کڑیل جوان تھے وہ۔ اُن کا کمرہ آنگن کے دوسرے سرے پر تھا۔ میں اپنی نیم وا کھڑکی سے ان کے کمرے کا جائزہ بہ آسانی لیا کرتا تھا۔ وہ چمپا سے کھل کر بات چیت کیا کرتے اور ان کے سفید سفید دانت بھی دِکھائی دیتے۔ مجھے ان پر خوب غصہ آتا کہ اُنھیں اس دو ٹکے کی چھوکری میں کون سے ہیرے جواہرات دِکھ گئے ہیں کہ وہ اس حور پری سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں۔ یوں تو وہ عورت ذات کی پرچھائیں تک سے بدکتے ہیں۔ بڑی بہن سرلا کی سہیلیاں جب گھر پر وارد ہوتیں تو بھائی صاحب کی حالت دیدنی ہوتی۔ ان کا چہرہ مرکری بلب کی

طرح سفید پڑ جاتا۔ لڑکیاں ان سے بات کرتیں تو وہ نظریں جھکائے، لڑکھڑاتی زبان سے ہم کلام ہوتے۔ مگر لڑکیاں اُنھیں چھیڑنے سے باز نہ آتیں۔ کبھی کبھی ان کے پسینے چھوٹ جاتے اور موقع پا کر وہاں سے کھسک لیتے۔ لیکن وہی لڑکیاں جب مجھ سے مذاق کرتیں تو میں ایسے کرارے جواب دیتا کہ مارے حیرت کے وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھا کرتیں۔ خاص طور پر لتا۔ کبھی کبھار وہ تمام مجھ سے ناراض بھی ہو جاتیں۔ لیکن میری نگاہیں برملا ان سے کہا کرتیں۔ ''تم بلاوجہ کیوں ناراض ہوتی ہو.....اس میں میرا کیا دوش ہے۔ میری جھلاہٹ میں ذرا جھانک کر تو دیکھو، اس کی تہہ میں کیا چھپا ہے اور میں کیا چاہتا ہوں؟''

ایک رات میں پڑھنے میں غرق تھا کہ سرلا دیدی کمرے میں داخل ہوئیں اور کتاب میرے ہاتھ سے چھین کر بے اختیار ہنسنے لگیں۔ مجھے کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ مگر وہ بدستور ہنسے جا رہی تھیں۔ میں شش و پنج میں ڈوبا کتاب کو چھیننے اُن کی طرف بڑھا تو انھوں نے کتاب کو اپنی پشت کے پیچھے چھپا کر شرارتاً کہا:

''لتا جب تم سے بات کرتی ہے تو تم اُسے کبھی کھرے کھرے جواب دیتے ہو اور کبھی سنجیدہ ہو جاتے ہو۔ شاید تم کو اس سے ......؟''

میں اپنی بہن کی نادانی پر ہنس دیا اور خود سے ہمکلام ہوا: ''آپ کیا جانو، جب آپ کی سہیلیاں مجھ سے بات کرتی ہیں تو میرے دل پہ کیا گزرتی ہے۔ اُن کے جوان بدن میری خواہش کو ہوا دیتے ہیں۔''

مجھ کو سوچتا ہوا پا کر دیدی کے ہونٹوں پر بامعنی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ بولیں:

''بس اب بنو مت۔ میں سمجھ گئی۔ تم کو لتا سے .....؟''

یہ کہہ کر کتاب انھوں نے میری طرف اچھالی اور کمرے سے چل دیں۔ میرے دل نے کہا کہ میری بہن کاش یہ سمجھ پاتیں کہ اس دنیا میں چند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو پیار محبت کے چکر میں نہیں پڑا کرتے۔ اُن کی نظر میں پیار محبت فضول سی اشیا ہیں۔ انھیں تو کوئی اور ہی شے درکار ہوتی ہے، جس کے بنا وہ زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

سرلا دیدی کے جاتے ہی میں اس قدر پریشان ہوگیا کہ بیان کرنا مشکل ہے۔لتا کا ہوشربا بدن آنکھوں میں گھومتا ہوا نظر آیا۔اُس نے میرے حواس پر کچھ اس طرح سے قبضہ کرلیا تھا کہ میری پوری مردانگی بیدار ہوگئی تھی۔درحقیقت وہ بدن ہی کچھ ایسا تھا کہ برہم اچاریہ بھی لنگوٹ ڈھیلا کردے۔میرے رگ و پے میں دوڑتا لہو اتنی تیزی سے گردش کرنے لگا کہ میرے اندرون خانہ آگ بھڑکتی ہوئی محسوس ہوئی۔کتاب کو مزید پڑھنا دشوار ہورہا تھا۔حالانکہ پڑھنے کی شعوری کوشش بھی جاری تھی۔مگر چیونٹیاں ترتیب وار مجھ کو کاٹے جارہی تھیں اور سوئیاں میرے سینے میں چھید کیے جارہی تھیں۔کتاب کو بستر پر پھینک کر میں پریشان آگے پیچھے کو قدم اُٹھانے لگا۔یہ عمل جاری تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور چمپا کھانے کی ٹرے لیے داخل ہوئی۔وہ میرا سرخ چہرہ، آنکھوں میں تیرتی بھوک اور بڑھتی ہوئی وحشت کو دیکھ کر گھبرا سی گئی۔اُس کا جسم مجھے پل پل اپنی طرف کھینچتا چلا گیا، یعنی وہ ہی میری پہلی منزل ٹھہرا ہو۔میری زبان میرے لبوں کو تر کرتی چلی گئی۔چمپا سہم گئی۔ٹرے اُس کے ہاتھوں میں لرزنے لگی، اُس نے فوراً ہی اُسے میز پر پٹکا اور مجھے دیکھے بنا وہاں سے چل دی۔میں اُس کو روک کر کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر اس نے موقع ہی نہ دیا۔

چاند بلندیوں پر تھا۔حویلی کے ساتھ گلی محلّہ بھی خاموش تھا۔رات سو رہی تھی۔مگر میں جاگ رہا تھا۔گلابی جاڑے کے موسم میں ہر کوئی لحاف میں دُبکا ہوا تھا۔لیکن میرا وجود آگ میں تپ رہا تھا۔دانت ہونٹ کاٹ رہے تھے اور ہاتھ سینہ مسل رہے تھے۔میں بستر پر مریض بنا کروٹیں بدل رہا تھا، جسے بروقت اگر خوراک میسر نہ ہوئی تو دم توڑ دے گا۔میں نے اُٹھ کر پانی پیا۔مگر شعلے جوں کے توں برقرار رہے۔انجام کار میرے پاؤں بھی میرے اختیار میں نہ رہے تھے۔وہ ازخود کمرے سے نکل کر چمپا کی کوٹھری کی طرف چل دیے، جو آنگن سے ہوکر ایک راہداری سے گزر کر پچھواڑے میں واقع تھی۔آنگن اندھیرے میں گم تھا۔حویلی چاند کی مدھم روشنی میں ڈوبی تھی۔میں دبے پاؤں چوروں کی طرح پھونک پھونک کر قدم رکھتا، دیواروں کا سہارا لیے کوٹھری کے قریب پہنچ گیا۔میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔کوئی آنکھ مجھ کو نہ دیکھ رہی تھی۔ہر طرف سناٹا

تھا۔لیکن میرا دل اوپر نیچے ہوکر دھک دھک کر رہا تھا اور میں صاف صاف اس کی آواز سن پا رہا
تھا۔کوٹھری کا دروازہ پُرانی طرز کا تھا۔میں نے دونوں پٹ دھیرے سے سرکائے۔ان کے سرکتے
ہی ان میں انگل بھر کا فاصلہ پیدا ہوگیا۔میں نے پہلی انگلی کی مدد سے پرانی زنگ آلود زنجیر کھول
ڈالی۔دروازہ کھلتے ہی میں سانس روکے اندر داخل ہوا۔کوٹھری میں لیمپ کی دھندلی سی روشنی پھیلی
ہوئی تھی۔چمپا چارپائی پر بے خبر سو رہی تھی۔اُس کے بدن کا کچھ حصہ رضائی سے ڈھکا ہوا تھا۔میں
نے لیمپ کی لو قدرے بڑھا کر چمپا کو گہری نظروں سے دیکھا۔اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ
تھی۔یقیناً وہ کوئی سپنا دیکھ رہی تھی۔اُس کی ایک ران ساڑی کے نیچے مچھلی بنی ہوئی چمک رہی
تھی۔اس کا ایک ہاتھ سینے پر تھا تو دوسرا نیچے لٹک رہا تھا۔سانس بھرنے پر اس کا کافر سینہ اوپر نیچے
ہوکر مجھ کو بے قابو کیے جا رہا تھا۔میں نے جھٹ سے آگے بڑھ کر اپنے تپتے سلگتے ہونٹ اس کے
ہونٹوں پر رکھ دیے۔اُن کا لمس اور گرماہٹ محسوس کرتے ہی وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی اور پریشان
پریشان سی مجھے تکنے لگی۔مجھے پہچاننے میں اس نے کوئی غلطی نہ کی تھی اور نہ ہی میرے خطرناک
ارادوں کو بھانپنے میں اس سے کوئی بھول ہوئی، اس نے دھکا دے کر مجھ کو خود سے الگ کرنا چاہا،
لیکن میں نے پھر سے اس کے ہونٹ اپنے ہونٹوں میں مضبوطی سے جکڑ لیے۔اس بار اس نے
زیادہ مزاحمت نہ کی اور جب میری زبان اس کی زبان سے بھڑنے لگی اور وہ بھڑتی ہی چلی گئی تو
میرے ہاتھ اس کی چھاتیوں کو محسوس کرنے لگے۔وہ گول، گرم اور گداز تھے۔زبان کا عمل جاری
رہا اور جب میرے ہاتھ اس کے بدن کے زیرِ ناف بڑھنے لگے تو اس نے اپنی پوری طاقت سے
جھٹکا دے کر مجھے خود سے الگ کر دیا۔میں گرتے گرتے بچا۔اگلا پل ہم دونوں کی قسمت کا فیصلہ
کرنے والا تھا۔چمپا نے گلا پھاڑ کر چلانا شروع کر دیا۔میں حواس باختہ سنبھل نہیں پا رہا تھا کہ ان
حالات میں کیا کروں؟ کیا نہ کروں؟ میں شرطیہ بازی ہار چکا تھا۔وہ برابر چلائے جا رہی تھی۔
میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔گھر کے سبھی افراد جاگ اٹھے تھے۔کمروں کی بتیاں روشن ہونے لگی
تھیں۔میں نے لپک کر کواڑ کھولے اور پچھواڑے کی راہداری اور آنگن کو پوری رفتار سے پھلانگتا
ہوا اپنے کمرے میں آن دھمکا۔بدن میں آیا ہوا زلزلہ سنبھل نہیں پا رہا تھا۔لیکن کچھ دیر میں جب

سانسیں معمول پر آ گئیں تو میں نے کتاب کو اُٹھا کر اس انداز سے پڑھنا شروع کر دیا، جیسے کوئی بھی واقعہ گزرا نہ ہو اور میں دیر سے اپنے کمرے میں موجود تھا۔ گھر کے سبھی افراد چمپا کی کوٹھری میں جمع ہو چکے تھے۔ اس کے رونے اور چلانے کی آوازیں بدستور جاری تھیں۔ پھر فضا میں رائے صاحب کی گرجدار آواز کے ساتھ چمپا کی کمزور آواز بھی اُبھری۔ مگر کوئی بھی سرا میرے ہاتھ نہ لگا۔ میں خود میں سکڑ چکا تھا۔ پھر رائے صاحب، ماں جی اور بڑے بھائی کی ملی جلی آوازیں بھی سنائی دیں۔ لگا کہ دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی اور میرا بدن ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔ اتنے میں آوازیں کم ہوئیں تو ایسا لگا کہ طوفان گزر گیا ہے اور میں بال بال بچ نکلا ہوں۔ لیکن عین اسی وقت کھڑاک سے کمرے کا دروازہ کھلا اور رائے صاحب دہلیز پر بندوق تھامے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نفرت تھی، آگ تھی، خون تھا۔ لیکن میری گردن میرے ساتھ نہ تھی۔ وہ زمین میں گڑ چکی تھی۔ دل نے چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور میں جیتا جاگتا اس میں سما جاؤں۔ رائے صاحب نے دروازہ اتنے زور سے بند کیا کہ ساتھ کے کمروں کی دیواریں بھی لرز اُٹھیں۔

رات بھر میں سولی پر لٹکا رہا۔ نیند کا تعلق آنکھوں سے ختم ہو چکا تھا۔ طرح طرح کے خیالات پریشان کرتے رہے۔ رائے صاحب کی بندوق آنکھوں سے الگ ہونے کو تیار ہی نہ تھی۔ پورا یقین تھا کہ صبح ہوتے ہی رائے صاحب مجھ کو گولی سے اڑا دیں گے۔ اگر کسی وجہ سے انھوں نے بندوق استعمال نہ کی تو ربڑ کی گیند سمجھ کر فرش پر اتنا پٹکیں گے کہ میری ہڈیاں چرمرا کر رہ جائیں گی۔ دل نے چاہا کہ اسی وقت گھر سے فرار ہو جاؤں۔ لیکن حویلی کے صدر دروازے پر وزنی تالا پڑا ہوا تھا، جس کی چابی سدا چمپا کے پاس رہا کرتی تھی۔ پھر حویلی کی بیرونی دیوار اتنی اونچی تھی کہ اُسے پھلانگنا ناممکن سا تھا۔ رات بھر میں خود کو کوستا رہا کہ مجھے ایسا قدم اُٹھانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ میں دوستوں کے ساتھ ''سرخ گلی'' میں بھی تو جا سکتا تھا۔ وہ بارہا مجھے ساتھ چلنے کو کہہ چکے تھے۔ لیکن میں وہاں جانے سے بدکتا تھا کہ مجھے والدین کے علاوہ پوشیدہ مرض کا بھی ڈر رہتا تھا۔

صبح آنکھ کھلی تو دھوپ آنگن میں اُتر چکی تھی۔ میں دیر تک سویا رہا۔ جانے کب آنکھ لگ

گئی تھی۔ بڑے بھائی کرسی پر بیٹھے میرے جاگنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں ان کے نزدیک گندی موری کا کیڑا بن چکا تھا۔ مجھ میں آنکھ ملانے کی ہمت ہی نہ تھی۔ بھائی صاحب نے مجھ پر بھرپور چوٹ کی: ''رائے صاحب نے حضور کو یاد فرمایا ہے۔ ذرا سنبھل کر جایئے گا۔'' پوری حویلی میرے سر پر آن گری تھی۔ بدن میں لہو کی گردش رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے بستر سے اُٹھنے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر لگا کہ جسم ساتھ چھوڑ گیا ہے۔ یقین ہو چکا تھا کہ کچھ دیر میں مجھے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ پسینے میں تر چہرہ لیے میں رک رک کر بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔ اندر رائے صاحب دونالی بندوق تھامے گھوم رہے تھے۔ اُن کی شعلہ بار آنکھیں آگ اگل رہی تھیں۔ مجھے دہلیز پر بھیگی بلی کی طرح کھڑا پایا تو چلا اُٹھے:

''حرام زادے! تجھے کوئی شرم ورم ہے یا نہیں؟ کبھی خاندان کی عزت کا بھی خیال کر لیا کرو۔''

میرے شریر میں لہو کا آخری قطرہ بھی خشک ہو چکا تھا۔ میں ایک قصوروار مجرم کی طرح ان کی عدالت میں کھڑا سزا سننے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ پھر سے گرج اُٹھے:

''اگر تم کو کچھ چاہیے تھا یا کسی چیز کی ضرورت تھی تو مجھ سے کہا ہوتا، اپنی ماں سے کہا ہوتا۔ چمپا کے گلے سے ہار اتارنے کی کیا ضرورت تھی؟ اب تم کو چوری کی عادت بھی ......''

یہ سننا تھا کہ میری گئی ہوئی جان واپس لوٹ آئی۔ مزید میں نے اُن کا کوئی لفظ نہ سنا اور نہ ہی جانا۔ آگے بڑھ کے اُن کے پانو پکڑ کر گڑگڑانے لگا:

''میں آپ کی اور ماں جی کی سوگند کھا کر کہتا ہوں، پھر کبھی چوری نہیں کروں گا۔ اس بار مجھ کو معاف کر دیں۔''

یہ کہتے وقت میں نے اُن کے پانو مضبوطی سے پکڑ لیے اور رونا شروع کر دیا۔ اُن کا دل پسیجا ضرور، مگر آنکھوں میں پھیلی ہوئی حقارت کم نہ ہوئی۔ گرج کر ماں جی کو پکارا:

''کانتا.... ہٹاؤ اس کم بخت کو میری نظروں سے۔ کہیں میرا ہاتھ چھوٹ نہ جائے۔ چور کہیں کا۔''

ماں جی بیٹھک کے باہر دیوار سے کان لگائے کھڑی تھیں۔ اندر داخل ہونے پر مجھ کو رائے صاحب کی ٹانگوں سے لپٹا ہوا پایا تو پریشان ہو گئیں اور جب انھوں نے مجھ کو اُٹھا کر سینے سے چمٹا لیا تو میں

پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اُن کی آنکھوں میں چند سوال تھے، مگر میرے پاس پچھتاوے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ میں اپنی ہی نظروں میں دنیا کا ذلیل ترین انسان بن چکا تھا، جس کا کوئی پُرسان حال نہیں ہوا کرتا۔

مجھے نیا جیون ضرور مل گیا تھا لیکن مجھ میں چمپا سے آنکھ ملانے کی ہمت جاتی رہی تھی۔ میرا دل کڑھتا رہتا کہ یہ سب میں نے کیا کر ڈالا ہے۔ چمپا کھانا لیے کمرے میں داخل ہوتی تو میں نظریں جھکائے منہ پھیر لیتا یا پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ میز پر کھانا رکھ کر چند پل اس انتظار میں کھڑی رہتی کہ میں پلٹ کر اُس کو ضرور دیکھوں گا، کچھ بات کروں گا۔ اُس رات کا بھی ذکر کروں گا اور یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ اس نے جھوٹ کیوں بولا تھا؟ لیکن میں بت بنا کھڑا رہتا اور وہ مایوس ہو کر چلی جاتی۔ ماں جی نے چپکے چپکے مجھ پر نظر رکھنا شروع کر دی تھی۔ وہ اِس پورے معاملے میں رائے صاحب سے زیادہ سیانی ثابت ہوئی تھیں۔ وہ جان گئی تھیں کہ اُس بھیانک رات میں مَیں نے چمپا کی کوٹھری میں داخل ہو کر، اخلاق سے گرا ہوا قدم کیوں اُٹھانا چاہا تھا۔ اُن کو میری جنسی بیداری اور اس کے خطرناک تقاضوں کا پورا پورا احساس ہو چکا تھا۔ انھیں یہ بھی ڈر تھا کہ میں جنسی جذبات سے مغلوب ہو کر وہی حرکت پھر سے نہ کر بیٹھوں اور خاندانی وقار مٹی میں رُل کر رہ جائے۔

ایک دوپہر کو چمپا، ماں جی کا شریر داب رہی تھی تو ماں جی نے بڑے چاؤ سے اُسے کہا:

''چمپا اب تو سیانی ہو گئی ہے۔ اب تو اپنا گھر بسا لے۔''

چمپا شرما گئی۔

''تیری ماں کو میں نے وچن دیا تھا۔ تیری ڈولی اِس گھر سے اُٹھے گی۔''

چمپا کی شرماہٹ اور بڑھ گئی۔

''شرمامت.... ہر لڑکی جوانی میں اپنا گھر بساتی ہے.... مَیں جلد تیری برادری میں کوئی بانکا سا جوان دیکھ لوں گی۔''

''نامیاناں!'' ماں جی کے کہے کا اثر اس پر اتنا گہرا ہوا کہ شرماہٹ کے غائب ہوتے ہی وہ سنجیدہ

ہو گئی اور اپنے حواس بھی برقرار نہ رکھ پائی:

''میں بیاہ نہ کروں۔ بیاہ نہ کروں.....میں یہیں رہوں.....میں بہت سُکھی ہوئی یہاں۔''

''پر جیون میں ہر لڑکی ہاتھ پیلے کیا کرتی ہے؟''

''نامیا ناں.....آپ میرے ماتا پتا ہو۔ میں زندگی بھر آپ کی سیوا کروں۔ بس۔ پر بیاہ نہ کروں۔''

یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ ماں جی کو سخت افسوس ہوا کہ وہ چمپا کا دامن زبردستی اُس کی مرضی کے خلاف کسی غیر سے باندھنا چاہتی ہیں۔ وہ من ہی من شرمندہ ضرور ہوئیں، مگر وہ اپنی جگہ مجبور تھیں کہ ان کو میری ذات، عادات اور اُٹھتی جوانی کا قطعاً اعتبار نہ رہا تھا۔ پھر ان کو خاندانی عزت کا بھی ہر دم خیال رہا کرتا۔ دیگر اُن کو رائے صاحب کی جلالی طبیعت کا بھی احساس تھا۔ ماں جی نے چمپا کو تسلی دلاسا دے کر چپ کرانا چاہا مگر وہ برابر روتی رہی۔ ماں جی نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا، پھر اُس کا کندھا تھپتھپا کر اُسے یقین دلایا:

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ رومت.....تیرا بیاہ تیری مرضی سے کریں گے.....ٹھیک۔ اب چپ ہو جا۔''

تب کہیں جا کر چمپا کے آنسو تھمے تھے۔ ماں جی نے اُس سے وعدہ تو کر لیا تھا کہ وہ اُس کا بیاہ اُس کی مرضی کے خلاف نہیں کریں گی۔ مگر وہ کہاں خاموش بیٹھنے والی تھیں۔ چند ہی ہفتوں میں انھوں نے چمپا کے واسطے ایک بانکا جوان ڈھونڈ نکالا تھا۔ وہ برسر روزگار تھا۔ رکشا چلاتا تھا۔ شکل وصورت کا بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ مزدوروں کی بستی میں ایک جھونپڑے میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ جھونپڑے سے کچھ فاصلے پر سوروں کا باڑا تھا۔ بستی میں جگہ جگہ غلاظت کے ڈھیر لگے رہتے۔ گندگی کے جانور وہاں ہر دم منہ مارتے نظر آتے۔ کوڑا کرکٹ ہر سو بکھرا رہتا اور اس کے انبار لگے رہتے۔ غرضیکہ راہ گیر وہاں سے گزرتے وقت ناک پر رومال رکھ کر، دوبارہ وہاں سے نہ گزرنے کی قسم کھاتے۔

پھر وہ دن بھی آ گیا، جب ماں جی اور سرلا دیدی نے چمپا کو اپنے ہاتھوں سے سجایا، سنوارا۔ بیاہ کا سارا خرچہ بھی ماں جی نے ہی اٹھایا تھا۔ رخصتی کے وقت دلہن کو نقدی سے بھری ہوئی ایک تھیلی بھی دی تھی، جس میں ماں جی نے اس کی پس انداز رقم کے ساتھ اپنی طرف سے بھی

روپے ملا دیے تھے۔ چمپا بیاہ کے سرخ جوڑے میں بڑی سُندر لگ رہی تھی۔ اس حد تک کہ اُس کا لباس، بناؤ سنگار، ہاتھوں کی مہندی اور گلے میں لٹکتا ہار قیامت ڈھا رہے تھے۔ میں ایک لمبے عرصے کے بعد اس کو دیکھ رہا تھا۔ حویلی چھوڑتے سمے اس نے پریوار کے ہر شخص کو تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا تھا۔ ماں جی اور رائے صاحب کے چرن بھی چھوئے تھے اور ہاتھ جوڑ کر صدق دل سے کہا تھا:

''مجھ غریب کو بہت پیار دیا آپ نے...... سُکھ بھی بہت ملا۔ میں ابھاری ہوں آپ سب کی۔''

پھر اس نے سرلا دیدی اور بھائی صاحب کے گلے مل کر آنسو بہائے تھے۔ آخر میں اُس نے مجھ کو بھی دیکھا تھا۔ میں چند قدموں کے فاصلے پر ہی کھڑا تھا۔ میری جھلک پاتے ہی اس کے رواں آنسو تھم سے گئے تھے۔ لگاتار مجھ کو دیکھتے ہوئے اس کے پھڑ پھڑاتے ہونٹ، فربہ بدن اور چوڑیاں بج اُٹھی تھیں۔ کچھ اس ڈھنگ سے کہ اس نے کھڑے کھڑے میرا گناہ بخش دیا ہو۔ وہ اُسی انداز میں سر اونچا کیے میرے قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔ میری آنکھوں میں اُتر کر اس نے مجھے شدت سے احساس دلایا کہ ہم دونوں نے بہت کچھ کھو دیا ہے۔ پھر اپنا پورا دل اُگل کر بولی:

''چھوٹے بابو! یہ گھر تورے کارن مجھ سے چھوٹا جائے ہے۔ میں یہاں سورگ میں تھی پر اب میں نرک میں جائے ہوں۔''

میں شرم سے پانی پانی ہوگیا اور میری گردن جھک کر رہ گئی۔

اس قصے کو بیتے ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں۔ لیکن میں تب بھی اور اب بھی اس پیچیدہ ذہنی گنجل سے آزاد نہیں ہو پایا کہ اس رات چمپا نے جھوٹ کیوں بولا تھا؟ مجھ کو رائے صاحب کے عتاب سے بچانے کی خاطر؟ یا آئے دنوں میں اپنی جنسی لذت اور اس کی تسکین پانے کی خاطر؟ گاہے گاہے یہ بھی گمان گزرتا کہ خود ہی میں نے کشتی کو ڈبویا تھا۔

☆☆

فاصلہ

میرا اٹھایا ہوا قدم ناکام ثابت ہو چکا تھا اور میں اپنے کیے پر سخت نادم تھا۔ اپنی ہی نظر میں میرا قد نصف رہ گیا تھا۔ میری شریکِ حیات ہاتھ میں گلاس تھامے کچن سے لوٹ آئی تھی۔ گلاس میرے سامنے رکھا اور دبا دبا لہجہ اختیار کیے بامعنی الفاظ سے مجھ پر برس پڑی:

''تم سمجھتے ہو پوری دنیا تم نے خرید رکھی ہے؟۔۔۔ ہر شخص تمہاری سوچ کے مطابق سانس بھرے؟۔۔ اور تمہاری سوچ کی داد دے؟''

کچھ دیر پہلے ہمارے درمیان گرم گرم مکالمہ ہوا تھا۔ میں اس کی سرزنش کے نیچے دبتا چلا گیا۔ اس کا پلڑا یقیناً بھاری تھا۔ لیکن میں نے چاہا تھا کہ میں اپنی صفائی میں چند وزنی دلائل پیش کر کے اسے مطمئن کرلوں کہ ایسا نہیں ہے، جیسا کہ وہ سوچ رہی ہے۔ لیکن مجھ میں ہمت ہی نہ ہوئی۔ اس لیے کہ وہاں تو جھلاہٹ تھی، ناپسندیدگی کی ابھرتی ہوئی لہر کے ساتھ علیحدگی کی جھلک بھی تھی۔ لہذا میرا محتاط ہونا لازمی تھا اور فکر مند ہونا بھی۔ گو کہ میں اپنی بیوی روتھ سنڈر لینڈ کے منفی اور مثبت رویّوں سے خوب واقف تھا اور اس کی متلون مزاجی کو جھیل رہا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر بھڑک اٹھا

کرتی اور مجھے ایسی کھری کھری سناتی کہ میرے ہوش ٹھکانے آجاتے۔ لیکن میں بوجوہ خاموش رہتا کہ وہ بلڈ پریشر کی مریضہ تھی۔ فشارِ خون چھلانگیں لگاتا جب اس کے سر پر سوار ہو جاتا تو وہ الگ ہی عورت جان پڑتی۔ مجھے اپنے دیش کی کالی ماں لگتی اور کبھی ماتا درگا۔ لیکن جب اس کا خونی دباؤ معمول پر آتا تو وہ الگ ہی شخصیت ہوا کرتی۔ میری پشت پر کھڑے ہو کر اس فکر میں ڈوبی رہتی کہ وہ میری گردن میں اپنی باہیں پھیلائے یا نہیں، اس وقت میری خواہش یہی رہتی کہ وہ میرے گالوں کے ساتھ میرے لبوں کو بھی چھوئے اور ان کا رس چرا کر اپنی دیرینہ محبت کا ثبوت ازسرِنو پیش کرے۔ مگر یہ سب خواب بن کر رہ گیا تھا اور میں اپنے باطن کے گہرے اندھیرے میں غرق ہوتا چلا گیا۔

اور اب وہ مجھے ڈانٹ ڈپٹ کر منظر سے غائب ہوگئی تھی۔ اس نے جاتے ہی اپنے کمرے کا دروازہ اتنے زور سے بند کیا کہ اس کی گونج سارے میں پھیل گئی۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اب دروازہ پیٹنے پر بھی وا نہیں ہوگا، خواہ میں کتنی ہی منت سماجت کروں؟ اپنی محبت کا واسطہ دوں، مگر دروازے میں ذرا بھی جنبش نہ ہوگی۔ اس نے چند ماہ سے میری صحبت میں پینا پلانا بھی ترک کر ڈالا تھا اور میں گلاس ٹکرانے کو ترس گیا تھا۔

وہ بیئر کا گلاس میرے آگے رکھ کر جا چکی تھی۔ شام ڈھلنے کی فکر میں تھی۔ میں ونڈز ورتھ کونسل کی فلک بوس عمارت کی دسویں منزل پر اپنے فلیٹ کی کشادہ کھڑکی سے برٹش ریل کی گاڑیوں کا نظارہ کر رہا تھا۔ ایسا جان پڑتا تھا کہ کسی بالک نے لائینوں کا جال زمین پر بچھا رکھا ہے اور وہ گاڑیوں کی آمد و رفت سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ منظر کے شمال جنوب میں واکس ہال ریلوے اسٹیشن واقع ہے اور مشرق میں کلیپم جنکشن۔ واکس ہال کی اہمیت اس وجہ سے ہمیشہ رہی ہے کہ اس کے پڑوس میں اوول (OVAL) کا سرسبز کرکٹ کا میدان موجود ہے۔ دنیا کا ہر وہ ملک جو نوآبادیاتی دور میں انگریزوں کا غلام رہ چکا ہے اور جہاں انگریز اپنا ایجاد کردہ کرکٹ کا کھیل چھوڑ آئے تھے، وہ آزاد ملک اب اپنے سابق آقاؤں کے ساتھ ایک ٹیسٹ میں وہاں ضرور بھڑا کرتا ہے۔ میں برسوں اس اسٹیشن پر ملازم رہا ہوں۔ اگر میچ انڈیا اور انگلینڈ کے درمیان ہوتا تو کرکٹ کے متوالے ہندوستانی

اپنا ترنگا جھنڈا اٹھائے، گاڑیوں سے اتر کر میدان کی طرف بڑھتے دکھائی دیتے۔ یہی حال پاکستانی تماشائیوں کا بھی تھا۔ جب ان کا میچ انگلینڈ سے ہوتا تو لاتعداد کھیل کے عاشق ہرا پرچم اٹھائے وہاں نظر آتے۔ مگر ان کی نسبت انگریزوں کا ہجوم کہیں زیادہ رہتا۔ وہ برٹش اور انگلش جھنڈے اٹھائے "BASH PAKIS, CRUSH INDIANS" کے نعرے لگاتے گاڑیوں سے اترتے۔ بعض دفعہ مختلف قومیت کے نعرے آپس میں ٹکرا جاتے۔ فضا میں تناؤ پیدا ہوتے ہی مجھ جیسے کمزور شخص کا دل دہل جاتا کہ کہیں اسٹیشن پر نسلی خون خرابہ نہ ہو جائے لیکن اسٹیشن پر پولیس کی موجودگی میں چھوٹی بڑی جھڑپ کے علاوہ کبھی کوئی سنجیدہ واردات رونما نہ ہوئی۔

اسٹیشن کے باہر اورورہ (AURORA) کافے تھا۔ میں مارننگ شفٹ کی ڈیوٹی پر جانے سے پہلے وہاں ناشتہ کیا کرتا تھا۔ میں تازہ تازہ اس ملک میں وارد ہوا تھا۔ ان دنوں نسلی امتیاز اور تناؤ اتنا زیادہ تھا کہ برٹش ریل کی ملازمت پانے کے باوجود میرا من واپس انڈیا لوٹ جانے کو چاہتا تھا۔ درحقیقت دائیں بازو کے ایک معروف رہنما اینک پاول نے تارکین وطن کے خلاف (RIVERS OF BLOOD) ''خون کے دریا بہنے'' کی اشتعال انگیز تقریر کر ڈالی تھی۔ شہ پاتے ہی اس کے پیروکار اور نیشنل فرنٹ کے جوشیلے اِسکن ہیڈ حرکت میں آ گئے۔ کئی ایشیائی نژاد لوگوں کی دکانیں توڑ پھوڑ دی گیں، چند مکان بھی نذرِ آتش ہوئے اور بعضوں کی پٹائی لبِ سڑک ہوئی۔ سفید فام راہ گیر وہاں کھڑے تماشا دیکھا کرتے۔ تارکینِ وطن ڈر ڈر کر اور چھپ چُھپ کر کام پر جایا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک مَیں بھی تھا۔ مگر جس ہفتے میری ڈیوٹی مارننگ شفٹ کی ہوتی تو پو پھٹنے پر میں بے خوف وخطر سونی سڑکوں کے درمیان چلتا ہوا اور ہندی فلموں کے گیت گاتا ہوا اورورہ کافِ میں داخل ہو جاتا۔ روتھ وہاں ویٹرس کا کام کرتی تھی۔ مست، الہڑ، متلون مزاج۔ مگر انتہائی تیز اور بے باک۔ ہر گاہک کے ساتھ دل کھول کر بات کرتی، مگر اتنا فاصلہ ضرور رکھتی کہ کوئی شخص غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی گاہک حدِ فاصلہ کو پار کر کے اس کے نزدیک آنے کی کوشش کرتا تو اس کا جواب کھلے لفظوں میں ایک ہی ہوا کرتا:

''اگلی بار آؤ گے تو میرے سیکشن میں مت بیٹھنا۔ ورنہ چائے بھی نصیب نہیں ہوگی؟''

کافِ میں زیادہ تر مزدور طبقہ اور نوکری پیشہ لوگ آیا کرتے تھے۔ میں نے ابتدا میں جب وہاں جانا شروع کیا تھا تو یہ سوچ کر بہت خوش ہوا تھا کہ اس کافِ کا مالک ضرور کوئی انڈین پنجابی ہوگا، جس کی خاندانی ذات اروڑہ رہی ہوگی۔ مگر اس نے کافِ کا نام اروڑہ بدل کر ارورہ اس واسطے رکھ چھوڑا ہے کہ انگریزوں کو ہندوستانی نام لیتے وقت دِقت نہ ہو۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ مجھے اپنے سوا وہاں کبھی کوئی ایشیائی شخص دکھائی نہ دیا۔ بعدازاں مجھ پر یہ کھلا کہ ارورہ رومن دیو مالا میں صبح کی دیوی کا نام ہے تو مجھے اپنی کم علمی پر سخت افسوس ہوا۔ روتھ کے علاوہ وہاں ایک اور بھی خدمت گزار تھی، جو کافِ کے جوان اطالوی مالک کی بیوی تھی۔ لیکن میں روتھ ہی کے سیکشن میں بیٹھنا پسند کرتا تھا، خواہ مجھے انتظار کیوں نہ کرنا پڑے؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ جب مجھ کو انگلش بریک فاسٹ پروسے گی تو ٹوسٹ قدرے جلا ہوا ہوگا۔ میں کڑک (WELL DONE) ٹوسٹ کھانے کا عادی ضرور تھا۔ لیکن روتھ اسے کچھ زیادہ ہی کڑک بنا کر لایا کرتی تھی۔ کبھی وہ نیم جلا ہوتا اور کبھی زیادہ۔ میں اعترض کرتا اور کبھی ناراض بھی ہو جاتا۔ لیکن وہ کچھ ایسی دِلکش مسکراہٹ کے ساتھ مسکرا دیتی، گویا میں اس کے نزدیک یوسفِ ثانی کا درجہ رکھتا ہوں۔ پھر نہایت پچکار کر مجھ سے کہتی، جیسے میں کولی چھوٹا سا بچہ ہوں۔

''کھالو کھالو۔ میری خاطر کھالو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔

''لیکن میں تم کو کیسے سمجھاؤں۔ میں جلا ہوا ٹوسٹ کھانے کا عادی نہیں ہوں؟''

''نئے نئے اس کنٹری میں آئے ہونا؟ اتنا بھی نہیں سمجھتے، یہ ٹوسٹ تمہارے سانولے رنگ سے میل کھاتا ہے اور اس کو سیکنے والی عورت سفید فام ہے۔''

''تو کیا ہوا؟ جلا ہوا ٹوسٹ کھا کر میرے پیٹ میں درد اٹھے گا؟''

''نہیں نہیں، بالکل نہیں۔ میں اسے دل سے بناتی ہوں۔ جانتے ہو کیوں؟''

میں روتھ کی باتوں، اداؤں اور منچلے پن کو پسند ضرور کرتا تھا۔ مگر جلا ہوا ٹوسٹ میرے حلق سے نہ اترتا تھا۔ وہ مجھے غصے میں بھرا ہوا دیکھتی تو مجھ کو مزید پچکارتی۔

''دراصل تمہارے رنگ میں نمک شامل ہے۔ جانتے ہو کون سا؟''

میں احمق بنا اس کا منہ دیکھا کرتا۔

''میں اس نمک کی بات نہیں کرتی، جسے کھانے کے دوران پلیٹ پر چھڑکا جاتا ہے۔۔۔تمھارا نمک تو سمندری ساحلوں پر پایا جاتا ہے۔''

اس کے کہنے میں کئی غیر مرئی پہلو پوشیدہ رہا کرتے، جن کی گہرائی میں اُترنا اور وہاں سے کچھ اخذ کر کے لوٹنا میرے واسطے مشکل نہ تھا۔ اس کا من، اس کا اندرون اور اس کی ذہنی کیفیات میری سمجھ میں آچکی تھیں۔ لیکن میرے لب وا کرنے سے پہلے ہی وہ ہم کلام ہو جاتی:

''غور سے دیکھو تو میرے رنگ میں دنیا بھر کی کشش چھپی ہوئی ہے اور تمھارے رنگ میں فطری حُسن۔ اگر یہ مل جائیں تو نسلی امتیاز کے کئی پہلو مٹ جائیں؟''

اور اس شام مَیں اور روتھ رنگوں کا فرق سمجھنے اور مٹانے میں جٹ گئے۔ وہ میرے سانولائے بدن کا انگ انگ چوم کر اپنے اندرون کو روحانی خوشی بخش رہی تھی، جب کہ مَیں اس کے جسم کی گوری چِٹی جِلد کو اپنی زبان سے ناپتا اپنے ارمان پورے کر رہا تھا۔ انگلینڈ آنے سے پہلے میری شدید خواہش رہی تھی کہ وہاں کسی سفید فام عورت کے بدن کے ہر حصے پر اپنی زبان اور ہونٹوں کی چھاپ چھوڑ کر رنگوں کا احساس مٹاؤں۔ مَیں اس کی سبز مائل آنکھوں میں کھو کر اس کے سنہرے بالوں کو بھی چومتا رہا۔ پھر ہم اچانک گتھم گتھا ہو گئے اور آکاش نے ہماری ہر حرکت کا نوٹس قریب سے لیا۔ اُس وقت میں نے اپنے بیڈ رُوم کی کھڑکی سے دیکھا کہ آسمان پر ست رنگی کمان پھیل گئی ہے اور اس کے ساتوں رنگ ہماری جسمانی حرکات میں بھی موجود ہیں۔

ایک خوشگوار صبح مَیں ناشتے کے دوران چُھری کانٹا پکڑے بیکن (BECON) کا ٹکڑا کاٹ کر لبوں کی طرف بڑھا رہا تھا کہ روتھ نے میرے قریب آ کر سرگوشی کی:

''خوش ہو جاؤ''

''کیوں؟ کوئی خاص بات ہے؟''

''ہاں! میں تمھارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔''

یہ سننا تھا کہ چھری کانٹا میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر پلیٹ پر جل ترنگ بجا اٹھے۔ بیکن کا ٹکڑا بھی میری وردی پر اپنا نقش چھوڑ گیا۔ میرے اڑتے ہوئے حواس دیکھ کر اس نے دریافت کیا:

''ڈارلنگ، کیا تم کو خوشی نہیں ہوئی؟''

شعوری یا لاشعوری طور پر میری گردن اثبات میں اوپر نیچے ہوتی چلی گئی اور جانے کیوں میں اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اگر تم انکار بھی کر دیتے تو بھی میں بچے کی پرورش ضرور کرتی۔ جانتے ہو کیوں؟''

میں بدحواس، مگر خود کو سنبھالتا اسے دیکھتا رہا۔

''وہ بچہ اس دنیا میں مِلا جُلا رنگ لے کر آئے گا ناں؟......... اور میں زندگی بھر تمھارا رنگ اس میں دیکھا کرتی۔''

اُس صبح میری ڈیوٹی پلیٹ فارم نمبر دو پر تھی۔ گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ لیکن میں ہر گاڑی سے اترتے ہوئے مسافروں کا کوئی نوٹس نہیں لے رہا تھا۔ میں ستون بنا کھڑا رہا۔ میں نے کسی مسافر کا نہ تو ٹکٹ چیک کیا اور نہ ہی کسی کا ہفتہ وار پاس دیکھا۔ میرا ذہن تو دہلی کے لاجپت نگر میں پہنچا ہوا تھا، جہاں میرے والدین رہائش پذیر تھے۔ چند روز پہلے ان کا خط آیا تھا۔ لکھا تھا:

''اب تمھارے قدم وہاں جم چکے ہیں۔ تم برسرِ روزگار ہو۔ سالانہ چھٹیوں میں گھر ضرور آؤ اور اپنی مرضی کی بیوی کو پسند کر کے ساتھ لے جاؤ۔ بہت سے رشتے آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں ایک دو اونچے خاندان کی لڑکیاں پسند بھی ہیں۔ مگر آخری پسند تو تمھاری ٹھہرے گی۔'' ______ یہ سب سوچ کر میرے دماغ میں طوفان اُمڈ آیا تھا۔ روتھ کے انکشاف نے میری زندگی میں ایک نیا باب کھول ڈالا تھا، جس کا بلا شبہ میں اہم کردار تھا۔ خاصی مغز پچی کے بعد ایک اڑتا ہوا خیال میرے ذہن سے گزرا کہ اس باب سے نجات پانا زیادہ مشکل نہ ہوگا، بشرطیکے میں منطقی دلائل کا سہارا لے کر روتھ کو اسقاطِ حمل کے لیے مجبور کر دوں۔ یوں بھی اس سوسائٹی میں حمل گرانا کوئی بڑی بات تصور نہیں کی جاتی۔ اس قسم کے واقعات تو ہر گھنٹے، ہر روز ہوا کرتے ہیں۔ جو بھی خرچ ہوگا، میں برداشت کر لوں گا۔ یہ سوچ کر میں ہر فکر سے آزاد ہو گیا تھا۔ مگر اس اماوس کی رات میں، جب میں

گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک نوزائیدہ بچہ میرے سینے پر پھیلا ہوا ہے۔ پھر اچانک مجھ سے الگ ہو کر اس کا قد بڑھتا چلا گیا اور ترشول اٹھا کر میری ہتیا کرنے لگا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے مجھے لہولہان کر ڈالا ہے۔ میں نے چیخنا چلانا چاہا، مگر میرے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی اور میں ہڑبڑا کر ڈراڈرا اُٹھ بیٹھا۔ دن بھر یہ بھیانک خیال میرے ساتھ رہا کہ وہ بالک جو سنسار میں آنے کا آرزومند ہے، اس کا وجود ختم کرنے کا ذمہ دار میں ہی ٹھہرایا جاؤں گا اور یہ احساسِ جرم دمِ رخصت بھی میرے ساتھ رہے گا۔

گھر سے خطوں کا آنا برابر جاری رہا۔ ہر خط کا متن قریب قریب ایک سا ہوا کرتا تھا۔

''کب آ رہے ہو؟ لڑکی والے متواتر پوچھا کرتے ہیں۔ وہ بھی جلدی میں نظر آتے ہیں۔ تمھاری چھٹیاں تو کب سے DUE ہیں۔ ہم بوڑھے ہو چکے ہیں۔ بھگوان کی شرن اور پوجا پاٹھ میں جیون گزارنے کی اِچھا رکھتے ہیں...... بس اب تم چلے آؤ۔ نین بچھائے بیٹھے ہیں۔''

یہ سچ میری پیدائش سے میرے ساتھ جڑا ہوا تھا کہ میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔ میرے ماتا پتا میرے سر پر سہرا بندھا دیکھ کر اپنا آخری فرض بھی نبھانا چاہتے ہیں کہ وہ ہندو دھرم کرم کے پابند ہیں۔ یہ ان کے سنسکار بھی ہیں اور اُن کے بغیر زندہ رہنا ان کے لیے محال بھی ہوگا۔ لیکن میں ٹال مٹول کرتا اپنی جان بچاتا رہا۔ مگر کب تک؟ میں اپنی ہی نظر میں دنیا کا بدترین، چالاک اور ناقابلِ اعتبار شخص بنتا جا رہا تھا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مَیں اپنی ہی عدالت میں مجرم بنا کھڑا تھا۔ چاروناچار قلم اُٹھا کر میں نے اپنے والدین کو صاف صاف لکھ ڈالا کہ میں نے شادی کر لی ہے۔ روتھ کون ہے اس کا پس منظر کیا ہے؟ اس کا خاندانی سلسلہ یوگوسلاو کے خانہ بدوشوں سے نسلاً جا ملتا ہے۔ اس کی تعلیم بس واجبی سی ہے۔ مگر دنیاوی معاملات میں اتنا علم رکھتی ہے کہ اچھے اچھوں کی چھٹی کر دے۔ کیفے میں وہ کس ڈھنگ کا کام کرتی ہے اور میں بہت جلد باپ بھی بننے والا ہوں۔

روتھ کا بدن روز بروز پھیل رہا تھا۔ اس نے کیفے میں کام کرنا بند کر دیا تھا۔ ہم بے پناہ خوش تھے کہ دو ہفتوں کے اندر اندر ہم اولاد کا منہ دیکھنے والے تھے۔ اس دوران گھر والوں کا خط

آیا۔لکھا تھا: ''تم نے بیاہ کرتے وقت یہ بھی نہ سوچا کہ تمھارے ماتاپِتا جیون کے آخری مرحلے میں ہیں؟ جانے کب وہ پران تیاگ دیں؟ ان سے مشورہ تو کیا ہوتا؟ تمھاری ماں کو جس قدر صدمہ پہنچا ہے وہ لفظوں میں بیان کرنا کٹھن ہے۔بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ جس قوم کی لڑکی سے تم نے بیاہ رچایا ہے، اس قوم کی اخلاقیات اور وفاداری کے معیار ہماری سنسکرتی سے بالکل الگ ہیں۔ان کے اخلاق کو تم کو سمجھنا ہوگا۔دوسری بات یہ ہے کہ جب ہمارے رشتہ داروں اور برادری والوں کو پتہ چلے گا کہ روتھ ایک عام سی عورت ہے جس کا خاندانی سلسلہ بنجاروں سے جاملتا ہے۔ اور وہ ایک ڈھابے میں پلیٹیں اٹھانے اور میزیں صاف کرنے کا کام کرتی ہے تو ہماری ناک کٹ کر رہ جائے گی اور ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔بہر حال تمھارا وِواہ تم کو مبارک ہو۔''

میرے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے روتھ نے جان لیا تھا کہ کہیں گڑبڑ ضرور ہے۔بے ساختہ پوچھ بیٹھی: ''بیک ہوم سب ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں ہاں بالکل.....لکھا ہے ہماری بہو کو ہمارا آشیرواد دینا۔۔اور یہ بھی لکھا ہے کہ بچہ ہونے پر اگلے سال تم سب انڈیا آؤ۔''

''ہم ضرور جائیں گے.......دہلی کے بعد آگرہ کا تاج محل دیکھیں گے۔''

روتھ کی آنکھوں میں جاگتے خواب دیکھ کر میں نے اس کی خواہشات کو بڑھاوا دیا۔

''جے پور گلابی شہر ہے۔ہم وہاں بھی جائیں گے....پھر وقت ملا تو اودے پور میں، پانی میں کھڑے محل کا بھی نظارہ کریں گے.....اور آخر میں متھرا کا مندر تو دیکھنا ہی ہے۔وہ دہلی کے بہت قریب ہے۔''

روتھ کا بے تحاشا مجھ سے لپٹ جانا فطری تھا۔میں روزِ اول سے اس کے پھیلتے ہوئے شریر کو دیکھتا اُس کو شدت سے چاہنے لگا تھا۔وہ بھی میری محبت اور میری چاہت پر فدا تھی۔

ہمارا بے بی بوائے نہایت خوبصورت جنما تھا۔گل گوتھنا۔اس کی شکل اور اس کا رنگ روپ دیکھ کر روتھ اکثر کہا کرتی کہ کرائسٹ (CHRIST) نے ہم دونوں کا رنگ ملا کر اس بچے میں ڈال دیا ہے۔مقامی لوگ ہمیں بچے کے ساتھ ہنستا کھیلتا دیکھ کر سوچیں گے کہ ملے جلے رنگوں

سے ہی دنیا بنا کرتی ہے۔ اور کوئی بھی رنگ دوسرے سے کم تر درجے کا نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ ہر رنگ کی اپنی اہمیت اور افادیت ہوا کرتی ہے۔

میرے والدین ضعیف ہو چکے تھے۔ میری دلی خواہش تھی کہ روتھ اور اروِن کو لے کر انڈیا ہو آؤں۔ اپنے خاندان کے ساتھ خاصا وقت گزاروں۔ اروِن کو ماں کی گود میں ڈال کر اس کی کئی تصویریں کھینچوں۔ روتھ بھی میرے بہن بھائیوں اور رشتہ داروں سے مل کر یقیناً خوش ہوگی اور ہم کئی مقامات کی زیارت کر کے واپس لوٹ آئیں گے۔ مگر میری خواہش اور میرا خواب پورا نہ ہوا؟ روتھ کا پاؤں پھر سے بھاری ہو گیا تھا۔ ان حالات میں روتھ کا سفر کرنا اور ننھا سا بچہ ساتھ لے کر جانا مناسب نہ تھا۔ چند روز بھی نہ بیتے تھے کہ ایک صبح ابھی نور کا تڑکا بھی نہ پھیلا تھا کہ پوسٹ مین ہمارے فلیٹ میں ایک لفافہ پھینک کر چلا گیا۔ ٹیلی گرام انڈیا سے آیا تھا۔ (سن ساٹھ کی دہائی کے آخیر تک انگلستان کے ان گنت گھروں میں ذاتی فون نہ تھا۔ مقامی لوگ زیادہ تر پبلک فون کا استعمال کرتے تھے) مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ ماتا پِتا میں سے کوئی ایک بھگوان کو پیارا ہو گیا ہے۔ لرزتے ہاتھوں سے میں نے لفافہ چاک کیا۔ پِتا جی چل بسے تھے۔ روتھ بھی بستر سے اُٹھ کر میری پُشت پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے تار اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے پوری ہمدردی سے افسوس ظاہر کیا۔ پھر صدقِ دل سے کہا: ''تم آج ہی انڈیا چلے جاؤ.... میری فکر مت کرو۔ میں یہاں سنبھال لوں گی۔''

میرے باطن میں اُتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ پِتا جی کا چہرہ اور ان کا قد و قامت آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ اُن کی طرح طرح کی باتیں بھی کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ مجھے خاموش پا کر روتھ بول اُٹھی:

''پیسے تو ہیں۔ اگر زیادہ کی ضرورت ہوئی تو میں اپنی جویلری پان بروکر (PAWN BROKER) کے ہاں گروی رکھ دوں گی۔ تمھارے لوٹنے پر چھڑا لیں گے؟''

''کل صبح انھوں نے آخری سانس لی ہے۔'' میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا: ''انتم سنسکار (Last Rites) تو کب کے ہو چکے ہوں گے۔ پھر.....؟'' میں اپنی ذہنی کیفیت کو واضح نہ کر پایا کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں اور کیا کہنا چاہتا ہوں؟ (اُن حالات میں مَیں اپنی فیملی کو تنہا چھوڑ کر

جانے کے حق میں بالکل نہ تھا) لیکن مَیں جذباتی ہو چکا تھا اور پریشان بھی کہ میری سوچ الفاظ میں ڈھل کر میرے لبوں تک نہ پہنچ پائی تھی اور الفاظ گُنگ ہو کر رہ گئے تھے۔

روتھ کو جب دوبارہ ماں بننے کا شرف حاصل ہوا تو وہ مجھ سے بھی زیادہ خوش تھی۔ اس مرتبہ اس نے ایک پیاری سی بچی کو جنم دیا تھا، جو ہو بہو اپنے بھائی پر گئی تھی۔ ویسی ہی گل گوتھنی۔ وہی ملا جلا رنگ روپ۔ ویسا ہی چہرہ، مگر نین نقش اپنے بھائی سے قدرے تیکھے، جو مجھ سے مشابہ تھے۔ روتھ کو بچی کی نگہداشت کے ساتھ اپنا خیال بھی رکھنا لازم ہو گیا تھا کہ وہ فشارِ خون (B.P.) کی مریضہ بن چکی تھی۔ مرض اسے گاہے گاہے پریشان کرتا رہتا۔ وہ مایا کی پرورش کے دوران اکثر کہا کرتی:

''دیکھا تم نے کرائسٹ ملے جلے رنگ کو کتنا پسند کرتے ہیں۔ ان رنگوں کے سہارے تو دنیا قائم ہے۔ اگر ہر شخص، ہر رنگ کے آدمی کو اسی طرح چاہنے لگے اور پسند کرنے لگے تو زندگی کے کتنے مسائل حل ہو جائیں؟ دنیا سے کتنی نفرت، کتنا اندھیرا دور ہو جائے؟''

بارہا اپنے گھر کا خوشگوار ماحول اور چھوٹی بڑی خوشیاں دیکھ کر مجھے خیال آتا کہ روتھ اور میں نے مل کر ایک جنت قائم کی ہے، جہاں نہ تو کوئی شجرِ ممنوعہ ایستادہ ہے اور نہ ہی وہ سیب موجود ہے جسے چکھ کر ہم جنت بدر کر دیے جائیں گے۔ شام میں جب بھی میں لاؤنج کے وسط میں بچوں کے آگے کھلونے پھیلا کر ان کے ساتھ کھیلا کرتا تو روتھ گھر کا سکون، بچوں کے ساتھ اپنا میرا پیار، شفقت ممتا اور دیکھ بھال کو دیکھ کر کہا کرتی:

''ہم چاروں جب مل بیٹھتے ہیں تو لگتا ہے کہ یورپ اور ایشیا دونوں کانٹی نینٹ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ دیکھنا باقی کے تین کانٹی نینٹ بھی اسی طرح مل جائیں گے۔ پھر دنیا میں امن ہی امن ہوگا۔''

لیکن میں سمجھ سکتا تھا اور اپنے اندرون کی نچلی سطح تک محسوس کر سکتا تھا کہ روتھ ایک IDEALIST ہے، آدرش وادی ہے۔ اسی نظریے اور جذبے کے زیرِ اثر وہ دنیا کو دیکھتی ہے اور اسی جذبے میں سرشار وہ میرے قریب آئی تھی۔ اور ہم نے صدقِ دل سے ایک نئی زندگی کی داغ بیل ڈالی تھی،

جس کا ثمر قدرت نے ہمیں دو صحت مند بچوں کی صورت میں عطا کیا ہے۔ اب وہ بچے وقت کے ساتھ ساتھ ہماری آنکھوں کے تارے بھی بن چکے ہیں۔

''جنت میں ہم دو ہمارے دو'' ہر پہلو سے مطمئن اور خوش تھے۔ بچے اسکول جانے لگے تھے۔ روتھ نے ارورہ ریسٹورنٹ میں پھر سے کام شروع کر دیا تھا۔ کیفے کا اطالوی مالک روتھ کے کام کو بہت پسند کرتا تھا۔ پرانے گاہک روتھ کو دوبارہ وہاں پا کر بہت خوش ہوئے تھے۔ کیفے کی بکری بھی بڑھ گئی تھی۔ روتھ بعد دوپہر بچوں کو اسکول سے گھر لے آیا کرتی تھی۔ وہ تیزی سے قد کاٹھ نکال رہے تھے۔ مگر انھیں دور سے یا نزدیک سے دیکھنے پر وہ نہ تو انڈین دکھائی دیتے اور نہ ہی انگلش۔ بلکہ میڈی ٹیرین (MEDITERRIEN) بحر روم کے کسی ملک کے لگا کرتے۔ لیکن ہم ان میں اپنے ملے جلے رنگ دیکھ کر بے پناہ خوش ہوتے۔ ایک رات جب ارون اور مایا اپنے مقررہ وقت پر ٹیلی ویژن دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور ممی ڈیڈی کے گال چوم کر اور ''گڈ نائٹ'' کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تو روتھ اٹھ کر میرے پاس چلی آئی۔ اس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور سر میرے کندھے پر رکھ کر کہا:

''راکی (راکیش) ڈارلنگ! خوش ہو جاؤ۔''

''کیوں کوئی خاص بات ہے؟''

''ہاں میں پھر سے ماں بننے جا رہی ہوں۔''

مجھے ذہنی جھٹکا لگا اور وہ بھی اتنا شدید کہ مجھے اپنی معلومات اور ہوش مندی پر شبہ ہونے لگا۔ میں اپنے دوسرے بچے کی پیدائش کے بعد روتھ کے بدن کو ان ہی دنوں میں چھوا کرتا تھا جو سیف پیریڈ کہلایا جاتا ہے اور جن میں حاملہ ہونے کے آثار جاتے رہتے ہیں۔ اس لیے کہ زندگی روز بروز مہنگی ہوتی جا رہی تھی۔ میری اور روتھ کی مشترکہ آمدنی سے بچوں کی متوازن غذا، ان کی پرورش، ان کی بے جا مانگیں، گھریلو اخراجات اور پانی، بجلی، گیس، ٹیلی فون اور انشورنس کے بل ادا ضرور ہو رہے تھے۔ مگر ہم بچوں کے مستقبل اور اپنے بڑھاپے کی خاطر اتنی رقم پس انداز نہیں کر پا رہے تھے، جتنی کہ درکار تھی۔ تیسرا بچہ آنے پر تو یقیناً ہمارا ہاتھ تنگ ہو جائے گا۔ روتھ کو بھی ملازمت سے

الگ ہونا ہوگا۔لیکن یہ تمام حقائق اپنی جگہ تھے اور میرا دل اپنی جگہ پہ۔

''تم جانتی ہو، بچے مجھے کتنے اچھے لگتے ہیں....اب آنے والا آہی رہا ہے تو ہم اُسے کیونکر روک سکتے ہیں؟....اگر خرچ پورے نہ ہوئے تو بندہ زیادہ اوور ٹائم کرلیا کرے گا۔''

وہ مجھ سے لپٹ گئی تھی، کچھ اس انداز میں کہ میرے جسم کی واحد مالک وہی ٹھہری ہو۔اسے کاٹنے اور اس پر دانتوں کے گہرے نشان چھوڑنے کا اختیار بھی اسی کو ہو۔

اس رات ہم نے برسوں بعد ایک دوسرے کے بدن کے تمام کس بل پہلی وصلی ملاقات کی مانند پھر سے نکالے تھے۔چاند بھی اس رات کئی ہفتوں کی غیر حاضری کے بعد روشن ہوا تھا۔

ہماری تیسری سنتان مقررہ وقت سے دس بارہ روز پہلے ہی سنسار میں چلی آئی تھی۔ روتھ کو اسپتال میں داخل کراتے وقت اس کا فشارِ خون اتنا بڑھ چکا تھا کہ میرے ہاتھ پانو پھول گئے تھے۔زچگی کے دوران بہت سی پیچیدگیاں بھی پیدا ہوگئی تھیں۔روتھ دردِ زہ کے اذیت ناک عمل سے گزرتی موت اور زندگی کے درمیان جھول رہی تھی۔

مَیں لیبر اور ڈلیوری وارڈ کے باہر کوری ڈور میں کھڑا مکمل بدحواس، فکرمند اور پریشان تھا۔مَیں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کڑے وقت کے گزرنے پر میں نس بندی کا آپریشن کروالوں گا۔تاکہ روتھ کو آئندہ اس جان لیوا عمل سے گزرنا نہ پڑے اور نہ ہی مجھ جیسے کمزور شخص کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے۔روتھ کی کربناک چیخیں برابر میرے کانوں سے ٹکرارہی تھیں۔میرا دل تو کب کا میرے حلق میں اٹکا ہوا تھا۔لیکن ڈاکٹر سیانے تھے۔وہ اپنے وسیع تجربات اور طبی ذہانت سے زچہ اور بچہ کو بچانے میں جتے ہوئے تھے۔پھر اچانک چیخوں کے ڈوب جانے پر ایک نرس نے آکر اطلاع دی کہ تمھاری وائف اور تمھارا بے بی بوائے دونوں صحیح سلامت ہیں تو میری جان میں جان آئی۔ تب میرے ہاتھ خود بخود آسمانی باپ کا شکریہ ادا کرنے کو فضا میں اُٹھ گئے۔

اپنے نوزائیدہ بچے کو پہلی بار ہاتھوں میں لینے پر جب میں نے فخریہ مسکراہٹ اور بھرپور پیار کے ساتھ اُسے غور سے دیکھا تو میری مسکراہٹ اور پیار چہرے پر فریز ہوکر رہ گئے۔اور

میرے ہاتھ کپکپا اُٹھے۔ لگا کہ بچہ میرے ہاتھوں سے چھوٹا جائے ہے۔ اس کا رنگ روپ اپنے بہن بھائیوں سے ذرا بھی میل نہ کھاتا تھا۔ اس کے بدن کی جلد بھی گوری چٹی تھی۔ بال سنہری تھے۔ آنکھیں بند تھیں، ورنہ وہ بھی اپنی زبان بولتیں۔ وہ گل گوتھنا بھی نہ تھا۔ جبکہ اس کے بہن بھائی میرے فربہ بدن سے کچھ نہ کچھ چرا کر دنیا میں آئے تھے۔ نوزائیدہ کو دیکھنے پر وہ بالکل ایک انگریز بچہ جان پڑتا تھا۔ میں اس کے وجود میں خود کو کہیں بھی نہیں پا رہا تھا۔ ایک بھیانک خیال میرے ذہن سے گزرا کہ ہو نہ ہو یہ بچہ میرا نہیں ہے۔ کسی غیر کا ہے۔ مگر یہ شکوک پیدا ہوتے ہی مجھے ندامت بھی ہوئی کہ روتھ تو میری دیوانی ہے۔ کتنا پیار کتنا احترام کرتی ہے میرا۔ بار ہا کہہ چکی ہے:

''راکی ڈارلنگ، تم میں اور ایک انگریز شخص میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ ہر دم اپنے فائدے اور اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ جبکہ تم ہمیشہ بچوں کی بہتری اور میرے متعلق سوچا کرتے ہو..... پھر سب سے بڑی بات، تم نے خود کے متعلق سوچنا ہی بند کر دیا ہے۔''

لیکن ان تمام حقائق کے باوجود مَیں نوزائیدہ بچے میں خود کو کہیں بھی نہیں پا رہا تھا۔

مَیں روتھ کو ہسپتال سے ہمیشہ کی طرح ٹیکسی میں لے کر گھر چلا آیا۔ گذشتہ دونوں بار ہسپتال سے چلتے وقت بچہ میری گود میں رہا تھا۔ اس کے رونے پر یا روتھ کے طلب کرنے پر بھی مَیں اسے اس کی ماں کے حوالے نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس بار بچہ روتھ کی گود میں تھا اور مَیں دوڑتی بھاگتی ٹیکسی سے عمارتیں، ٹریفک اور ڈبل ڈیکر بسیں دیکھ رہا تھا۔

گھر میں ارون اور مایا بے پناہ خوش تھے۔ انھیں بیٹھے بٹھائے ایک کھلونا مل گیا تھا۔ وہ اپنے نئے نویلے بھائی مائیکل کے سرہانے کھڑے اُسے ٹکر ٹکر دیکھا کرتے۔ محتاط ہو کر اس کے گال چھوا کرتے اور اُسے چوما بھی کرتے۔ اب اس کی آنکھیں وا ہونے لگی تھیں۔ اس کی سبز مائل آنکھوں کا رنگ بھی اپنی ماں پر گیا تھا۔ وہ روتا تو اس کے بہن بھائی بھاگ کر اپنی ماں کو اطلاع دیتے۔ ایک بار بالکل ایسا ہی ہوا۔ شام اُتر رہی تھی۔ ہر کوئی گھر پر تھا۔ مائیکل کے رونے پر بچے بھاگ کر کچن میں داخل ہوئے۔ روتھ، مائیکل کے واسطے دودھ کی خوراک تیار کر رہی تھی۔ اُس نے وہیں سے مجھ کو آواز دی:

''دیکھوتو مائیکل رو رہا ہے۔اُسے اُٹھالو۔میں دودھ لے کر بس آئی کہ آئی۔''

لیکن میرے ساتھ مصیبت یہ تھی کہ مَیں جب بھی مائیکل کے قریب گیا،اُسے اُٹھاتے وقت میرے ہاتھ کانپ اُٹھے۔وہ مجھے اجنبی سالگا۔اُسے نہایت غور سے دیکھنے پر بھی میں نے خود کو اس کے کسی انگ میں نہ پایا۔ایک بار روتھ نے مذاقاً اور شکایتاً کہا بھی تھا:

''جب سے میں ہسپتال سے آئی ہوں تم مائیکل سے دور دور رہتے ہو؟......نہ تو پہلے بچوں کی طرح مائیکل کے آگے پیچھے ہوتے ہو اور نہ ہی اُسے اُٹھا کر بانہوں میں بھرتے ہو؟ اور نہ ہی اُس کے گال چوم چوم کر سرخ کرتے ہو؟''

''ہاں ہاں....نہیں نہیں ...ہاں...'' پھرمیں نے خود پر قابو پالیا:

''مائیکل اپنے بہن بھائیوں سے بالکل الگ الگ سادِکھتا ہے؟''

''ہاں۔وہ پورے کا پورا مجھ پر گیا ہے۔'' اُس نے فخریہ کہتے ہوئے گردن اونچی کر لی۔

''اور میں....؟''

''تمھارے بغیر مائیکل اس دنیا میں کیونکر آسکتا تھا.....ذرا سوچو تو؟''

مَیں اس سے کیا کہتا کہ سوچنا تو مَیں نے اسی روز سے شروع کر دیا تھا جب مائیکل کو پہلی بار مَیں نے آنکھ بھر کر دیکھا تھا۔مجھے دھکا لگا تھا کہ وہ میری اولاد نہیں ہے، کسی غیر کا بچہ ہے وہ، جس کا بدقسمتی سے مَیں ہی باپ کہلایا جاؤں گا۔پھر میرا یہ خیال دھیرے دھیرے جڑ پکڑتا یقین کا روپ دھار بیٹھا کہ روتھ نے جب دوبارہ کافِ ارورہ میں ملازمت کی تھی تو اس نے وہاں کے حسین مالک یا کسی انگریز گاہک کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ لیا تھا۔یہی وجہ تھی کہ وہ ان دنوں بہت خوش خوش رہنے لگی تھی۔ایک بار مَیں نے وجہ بھی جاننا چاہی تھی تو اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا تھا:

''راکی ڈارلنگ، دوبارہ کام شروع کرنے پر مَیں نے محسوس کیا۔مَیں پھر سے آزاد ہو گئی ہوں.... بچے اسکول جانے لگے تھے.....تم کام پر چلے جاتے۔مَیں گھر کی دیواروں میں گھری خود کو بہت اکیلا پایا کرتی۔مگر اب مجھ کو نیو لائف مل گئی ہے..... کسٹمرز سے زیادہ تو گَیونا [1] خوش رہتا ہے

---

[1] انگلش SLANG میں مالک کو گَیونا کہتے ہیں۔یہ گورنر کا مخفف ہے۔

....پُرانے کسٹمرز بھی زیادہ آنے لگے ہیں اور سیل بھی بڑھ گئی ہے۔''

''اور تمھاری سیلری بھی؟''

''ہاں۔مگر میری توقع سے کم......مگر چند ماہ میں ضرور بڑھ جائے گی۔گئونا ہمیشہ مجھ پر مہربان رہا ہے۔''

گھر میں تناؤ کے بڑھ جانے پر روتھ محسوس کرنے لگی تھی کہ میں صرف مائیکل سے ہی نہیں، اس سے بھی پرے پرے رہنے لگا ہوں۔مَیں اس سے صرف کام ہی کی بات کرتا۔ورنہ کتاب یا اخبار پڑھنے میں مگن رہتا یا بچوں کے امور میں دلچسپی ظاہر کرتا۔ مائیکل کی طرف قدم بڑھاتے وقت کوئی غیر مرئی طاقت میرے پانو میں بیڑی ڈال دیتی اور میرے پانو وہیں جم جاتے۔میرا ضمیر بار ہا مجھ سے کہہ چکا تھا کہ کسی کا گناہ اُٹھا کر گلے لگانا اور اُسے اپنی اولاد سمجھ کر پالنا عقلمندی نہیں ہے۔روتھ میری ہر حرکت پر برابر نظر رکھا کرتی۔بعض دفعہ اس کی پریشانی اس قدر بڑھ جاتی کہ وہ جی بھر کر مجھے کوستی۔ میں خاموش اُسے دیکھے بغیر دوسرے کمرے میں چلا جاتا۔اس پر وہ مزید پریشان ہو جاتی اور اس کا بلڈ پریشر اتنا بڑھ جاتا کہ اس کا چہرہ ڈراؤنا نظر آتا۔جلی کٹی سنانا اس کی فطرت بنی جا رہی تھی۔میری خاموشی حد سے زیادہ بڑھ جانے پر جب وہ برداشت نہ کر پاتی تو چارحرفی فحش لفظ کا سہارا لے کر مجھ پر برس پڑتی۔ میں اُسے دیکھتا ہی رہ جاتا۔ برسوں کی ازدواجی زندگی میں اُس نے اِس طرح کی گھٹیا زبان کبھی استعمال نہ کی تھی۔خیال آیا کہ آدمی اپنے خاندانی پس منظر اور ماحول سے الگ ہو کر کتنا بھی مہذب کیوں نہ بن جائے؟ لیکن وہ اپنے لہو، اپنے ماضی سے الگ نہیں ہو پاتا۔اس کی سرشت ہزار پردوں کو چیر کر بھی بولنے لگتی ہے۔روتھ کی اونچی اونچی آوازیں سُن کر بچے سہم جاتے۔ننھا مائیکل ڈر کر رو دیتا۔روتھ دیوانہ وار لپک کر اُسے اُٹھا لیتی۔مَیں سوچتا رہ جاتا کہ ان پریشان کن اور ہنگامہ خیز ماحول میں اپنا جیون کب تک گزاروں گا؟

وقت رو کے کہاں رکتا ہے؟ وہ پر لگا کر اُڑتا رہتا ہے۔ایک روز مَیں دوپہر کی ڈیوٹی بجا کر شام دیر سے گھر لوٹا۔ بچے سو رہے تھے۔ مائیکل بھی اپنی COT میں بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ لیکن روتھ جاگ رہی تھی۔اُس سے مختصر کلام کے بعد مَیں نے کچن میں داخل ہو کر ڈنر کرنا چاہا۔

کچن لاؤنج سے چار ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔ روتھ وہاں بیٹھی اُکھڑی اُکھڑی سی دِکھائی دے رہی تھی۔ مَیں نے جونہی پلیٹ اُٹھائی، اُس کی گرج دار آواز سارے میں پھیل گئی: ڈِنر بعد میں کرنا، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

میرے لاؤنج میں داخل ہونے پر اُس نے دروازہ بند کر ڈالا کہ بچوں کی نیند میں خلل نہ ہو۔

''کیا ہے؟'' مَیں نے بھی روکھے پن سے قدرے اونچا لہجہ اختیار کیا۔

''شور مت مچاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔''

میں بیٹھ گیا اور لاؤنج کی مدھم روشنی میں اُس کا غصے سے پھولا ہوا چہرہ صاف صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ بھیانک ہوا جا رہا تھا۔ اس نے اپنا اعتماد بحال کرنے کی خاطر کمرے میں چند قدم آگے پیچھے کی طرف اُٹھائے اور میرے قریب آ کر بولی:

''کیا تمھیں یاد ہے کہ مائیکل اگلے ہفتے ایک برس کا ہو جائے گا؟''

مجھے واقعی اُس کا یومِ ولادت یاد نہ رہا تھا۔ مَیں شرمسار، سر کھجاتا ہی رہ گیا۔

''اُس کی سالگرہ ہمیں منانی ہے۔ بچے بھی ضد کر رہے ہیں ...... مگر سال بھر میں تم نے مائیکل کو مشکل سے سات آٹھ بار ہی اُٹھایا ہوگا؟ ...... وہ بھی میرے کہنے پر اور مجبور کرنے پر .... مَیں پوچھتی ہوں کیوں؟''

یہ سن کر مَیں ایک طرح سے خوش بھی ہوا کہ اپنا دل اُگلنے کا موقع شاید ہی نصیب ہو۔

''مَیں پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں کہ مائیکل مجھے دوسرے بچوں سے بالکل الگ الگ سا دِکھتا ہے ...... ایسا لگتا ہے وہ ...... وہ آکاش سے اُترا ہے۔''

وہ چونکی۔ لیکن اس نے طنزاً جواب دیا: ''کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ مائیکل تمھارے بچوں کا بھائی نہیں ہے؟''

''مَیں نے یہ کب کہا؟''

''پھر تم کیا یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ تم مائیکل کے باپ نہیں ہو؟''

''اِس کا جواب تمھارے پاس ہے صرف تمھارے پاس؟''

یہ سننا تھا کہ اُس کے چہرے پر آگ سی لگ گئی۔ وہ زخمی شیرنی کی طرح میری طرف لپکی۔
''تمھارا مطلب ہے جب مَیں نے کافِ میں دوبارہ کام شروع کیا تو مَیں نے وہاں کسی غیر کے ساتھ ناجائز رشتہ قائم کرلیا تھا؟''
''اس کا جواب بھی تمھارے پاس ہے صرف تمھارے پاس؟''
''شٹ اَپ! مَیں نے تمھارا گندہ ذہن پڑھ لیا ہے۔'' وہ بالکل میرے قریب آ گئی۔ پھر میری آنکھوں سے ہوکر میرے دل میں چھید کرنے لگی:
''میرج کے بعد مَیں نے تمھارے سوا کسی دوسرے شخص کا ہاتھ پکڑا ہو تو مَیں گنہگار...... تمھیں یقین آئے تو ٹھیک، ورنہ فیصلہ کورٹ اور ڈائی ورز کی صورت میں ہوگا۔ مَیں تمھارا سائیلنٹ ٹارچر اب اور برداشت نہیں کرسکتی۔''
دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ اچانک رُک گئی۔ گویا مزید اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ بولی:
''مَیں نے ایک خواب دیکھا تھا، جب تم لوگ نئے نئے اِس ملک میں آئے تھے۔ مگر تم بالکل ری ایکشنری (رجعت پسند) نکلے۔ اب وہ خواب ڈھیر ہوگیا ہے اور اس کے ذمہ دار تم ہو؟''

وہ رات مجھ پر واقعی بھاری گزری تھی۔ مگر ایک بات میرے ذہن میں بالکل صاف ہوچکی تھی کہ روتھ نے اپنی صفائی میں جو کچھ بھی کہا ہے، اُس کے پس پشت اس کا اپنا گناہ کارفرما تھا، جس پر پردہ ڈال کر وہ میرے ساتھ نفسیاتی ناٹک کھیل رہی تھی۔ لیکن مَیں اس کی باتوں پر ایمان کیونکر لے آتا؟ جبکہ مائیکل کے وجود میں مَیں کہیں بھی شامل نہ تھا۔ روتھ نے میرے پہلے دو بچوں کو بھی تو جنا تھا؟ جن میں روتھ کے ساتھ مَیں بھی موجود تھا۔ مگر اس بار......؟؟ میرے اردگرد پھیلا ہوا اندھیرا چھٹا تو مجھے اپنی بنیاد، اپنی زمین ہموار کرنے کا خیال آیا۔ تاکہ مستقبل قریب میں مَیں کوئی مثبت قدم اُٹھا پاؤں؟ یہی سوچتے سوچتے اُس رات میں لاؤنج کے صوفے پر دراز ہوگیا۔ روتھ نے میرا بستر وہاں رکھ چھوڑا تھا۔ نیند کوسوں دور تھی۔ طرح طرح کے بے ربط خیالات مجھے پریشان کررہے تھے۔ اچانک میرے والد مرحوم کہیں سے نمودار ہوکر میرے سامنے آن

کھڑے ہوئے اور وہ اپنا کہا دہراتے چلے گئے۔
''جس قوم کی لڑکی سے تم نے بیاہ رچایا ہے، اس قوم کی اخلاقیات اور وفاداری کے معیار ہماری سنسکرتی سے بالکل الگ ہیں۔ تمھیں ان کی اخلاقی روایات کو سمجھنا ہوگا اور اُن کے انوسار اپنا جیون گزارنا ہوگا۔''
مجھے سخت افسوس ہوا کہ میں مختلف تہذیبوں کا شکار ہوا جا رہا ہوں اور جانے میرا حشر کیا ہوگا؟ اِن حالات میں میرا روتھ کے ساتھ رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ گو کہ مَیں اس سے بھرپور محبت کرتا تھا۔ لیکن ہمارے درمیان اب مائیکل آن کھڑا ہوا تھا، جو میری آنکھ کو نہ تو ایک پَل بھاتا تھا اور نہ ہی گھر میں اس کی موجودگی برداشت ہوتی تھی۔ لیکن میرے اپنے بچے میرا خون تھے، میرے لختِ جگر تھے۔ اُن سے الگ ہونے کو مَیں کسی بھی قیمت پر تیار نہ تھا۔ خواہ مجھے قانونی کاروائی کیوں نہ کرنی پڑے؟

ہمارا فیملی ڈاکٹر (جی پی) شمالی آئرلینڈ کا کیتھولک آئرش تھا۔ وہ ڈاکٹر تو تھا ہی، ماہر نفسیات بھی کسی طور کم نہ تھا۔ اُس کی سرجری ہماری قیام گاہ سے دور نہ تھی۔ مَیں مقررہ دن کے مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گیا تھا۔ مَیں نے ڈاکٹر کو اپنے مسئلے سے وابستہ روتھ، مائیکل اور اپنے متعلق ہر پہلو تفصیل سے بیان کر دیا۔ وہ دیر تک خود میں گم رہا۔ کبھی کبھار وہ مجھ کو آنکھ بھر کر دیکھ لیتا۔ شاید وہ مسئلے کا کوئی حل تلاش کر رہا تھا۔ انجام کار اُس کے لبوں پر ہلکی ہلکی بامعنی مسکراہٹ اُبھری تو مَیں اس کو سننے کے لیے تیار ہو گیا۔
''تم کو شک تھا لیکن اب یقین ہو چلا ہے کہ تمھاری وائف نے بے وفائی کی ہے اور وہ بچہ تمھارا نہیں ہے؟''
''ہاں ڈاکٹر۔''
''مگر ایک بات تم سے ضرور کہوں گا؟''
میرے کان کھڑے ہو گئے، پلکیں جھپکائے بنا مَیں اُسے دیکھتا رہا۔ وہ بولا:

''عام طور پر ہر بچہ اپنے ماں باپ، دونوں سے کچھ نہ کچھ حاصل کر کے پیدا ہوتا ہے۔ اِس لیے کہ عورت کا ایگ (EGG) اور مرد کا سپرم (SPERM) تحلیل ہو کر ایک خاص سمت میں سفر کرتے ہیں۔ مگر طبی اعتبار سے مرد اور عورت میں چونکہ ہزاروں جاندار اور کمزور GENES پائی جاتی ہیں۔ اُن کی کوئی بھی طاقتور GENE سات پشتوں تک اپنا رنگ دِکھا سکتی ہے، یعنی وہ خود کو دہرا سکتی ہے۔''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ بچہ اپنی ماں یا باپ کی کسی جاندار GENE کے تحت اُس کا کوئی مرض، رنگ روپ، شکل صورت لیے اُس کی ہو بہو ڈپلی کیٹ کاپی بنا دُنیا میں چلا آتا ہے.....اور یہیں سے ہسبنڈ اور وائف کے درمیان شک کی لکیر اُبھرتی ہے۔''

''مگر یہ کیونکر ممکن ہے؟'' مَیں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا: ''میرے دونوں بچوں کا رنگ روپ، نین نقش بالکل الگ ہیں۔ ان کے بال بھی سیاہی مائل ہیں۔ مگر یہ بچہ تو سنہری بال، صاف دودھیا رنگ، سبزی مائل آنکھیں اور نین نقش بھی اپنے بہن بھائیوں سے الگ رکھتا ہے؟''

ڈاکٹر میرا ذہن غالباً جان گیا تھا۔ مسکراتے مسکراتے اچانک محتاط ہو گیا۔ بولا:

''میرج لائف پارٹنرز کے درمیان یقین اور بھروسے پر چلا کرتی ہے ......لیکن تمھارے کیس میں اگر تمھارا، تمھاری وائف اور تمھارے بے بی بوائے کا بلڈ ٹیسٹ (Blood Test) کروایا جائے تو کیسا رہے گا؟''

''یہی تو مَیں چاہتا ہوں۔''

''تب تمھارا ذہن بھی صاف ہو جائے گا۔ پھر ڈاکٹر نے کرسی پر پہلو بدلا:

''اگر دوسرے ٹیسٹ کروانے کی نوبت آئی تو وہ بعد میں ممکن ہیں .....تمھاری وائف ٹیسٹ دینے سے انکار تو نہیں کرے گی؟''

اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ مَیں خاموش رہا۔ مگر ڈاکٹر میری خاموشی کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

''تم اپنی وائف سے پوچھ لو.....اگر وہ ٹیسٹ دینے سے ہچکچائے یا ٹال مٹول کرے یا صاف انکار

کر دے تو سمجھ لینا، وہ وفادار نہیں تھی۔ اُس نے ADULTRY کی تھی .... تب تک مَیں ہسپتال میں ٹیسٹ کروانے کا بندوبست کرتا ہوں۔''

چند روز بیت گئے۔ لیکن مجھ میں روتھ سے پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی اور نہ ہی حوصلہ پیدا ہوا۔ مجھے اس سے خوف آتا تھا۔ اُس کے چیخنے چلانے اور برہنہ الفاظ سن کر میرا بدن کپکپا اُٹھتا۔ لیکن مسئلہ اپنی جگہ گھمبیر تھا اور روتھ سے جاننا ناگزیر تھا۔

ایک شام ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گھر کی طرف قدم اُٹھاتے ہوئے مَیں نے دل کڑا کر لیا تھا کہ گھر پہنچ کر روتھ سے دریافت کر کے ہی دم لوں گا کہ مائیکل کا اصل باپ کون ہے؟ خواہ پانی پت کی لڑائی یا مہابھارت کا یدھ کیوں نہ چھڑ جائے؟ گھر میں داخل ہوا تو بچے لاؤنج میں کھیل کود رہے تھے۔ انھیں پیار کرتے وقت مَیں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی مگر روتھ کہیں نظر نہ آئی۔ خیال آیا کہ وہ اپنے کمرے میں ہوگی؟ لیکن میں کچن میں داخل ہوا تو وہ اتفاق سے وہاں موجود تھی۔ مَیں نے چائے کی کیتلی کا بٹن دبایا۔ اخلاقاً اُس سے بھی چائے کے لیے پوچھا۔ مگر اس نے صاف انکار کر دیا اور تنی ہوئی گردن اور پتھرائی ہوئی نظروں سے مجھ کو دیکھتی چلی گئی، گویا مجھ سے کوئی گناہِ کبیرہ سرزد ہو گیا ہو۔ سخت لہجہ اختیار کیا۔ بولی:

''تم ڈاکٹر سے سرجری میں ملے تھے؟''

''ہاں....تو؟''

''آج سرجری سے فون آیا تھا۔''

''پھر......؟''

''ری سیپشنسٹ (Receptionist) جاننا چاہ رہی تھی کہ ہم نے بلڈ ٹیسٹ کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''تو......؟''

''مَیں نے کھلے لفظوں میں اس سے کہہ دیا کہ مَیں کوئی بھی وقت، کسی بھی لیبارٹری میں، کسی بھی ہاسپٹل میں اپنا اور مائیکل کا خون ٹیسٹ کروانے کو تیار ہوں.... رہا میرا ہسبنڈ تو وہ ڈاکٹر کو خود ہی

فون کرے گا۔‘‘
یہ کہہ کر وہ تیزی سے کچن سے نکل گئی۔ لگا کہ جلد گھر میں طوفان آنے والا ہے؟ دیواریں آپس میں ٹکرائیں گی۔ مَیں اور روتھ ہاتھا پائی کی نوبت سے بھی گزریں گے۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ نہ طوفان آیا، نہ دیواریں ٹکرائیں اور نہ ہی ہاتھا پائی ہوئی۔ لیکن روتھ نے جس جوش کے ساتھ اپنا فیصلہ سنایا تھا، اُس میں اس کی زخمی روح، سچ بولتی آنکھیں اور بے باک لہجہ بھی شامل تھا۔ انھوں نے مجھے اتنا جھنجوڑا، اتنے جھٹکے دیے کہ میرے شکوک اور میرا یقین متزلزل ہونے لگے۔ مجھے اپنی عمارت کے ساتھ آس پاس کی بلند و بالا عمارتیں بھی ہلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اچانک یہ خیال بھی کوندا بنا لپکا کہ کسی شخص پر بغیر کسی ثبوت کے شک کرنا ذہنی دیوالیہ پن کی نشانی ہے۔ بلکہ ماہر نفسیات کے نزدیک دوسرے کو روحانی طور پر زخمی کرنا ہے...... تو کیا مَیں بھی ان رویوں کے تحت روتھ کو ناحق زخمی کرتا رہا؟ اُسے اذیت دیتا رہا؟ یہ محسوس کرتے ہی میرا ضمیر اور میری ذات چوراہے پر کھڑے مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ مَیں اپنے ہنستے کھیلتے پریوار کو برباد کرنے پر کیوں تُلا بیٹھا تھا؟ ہر چھوٹے بڑے کی مسکراہٹ چھیننے کے در پے کیوں تھا؟
مَیں نیند کو آنکھوں میں لیے لاؤنج کے صوفے پر دراز کروٹیں بدلتا جا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ سوچتا بھی جا رہا تھا کہ شام میں جب روتھ اپنا فیصلہ سنا کر چلی گئی تھی تو اس سمے بھگوان رام میرے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ وہ بھگوان ہوتے ہوئے بھی اک عام منش کے روپ میں دھرتی پر آئے تھے۔ وہ بھی اپنے جیون میں شک سے الگ نہیں ہو پائے تھے، جبکہ سیتا میا کو رام جی نے ہی راون کے چنگل سے آزاد کرایا تھا۔ مگر سیتا میا کو اپنی پاکیزگی کا ثبوت اگنی پریکشا کی صورت میں دینا پڑا تھا۔ وہ پوتر دیوی جب بلا کسی ڈر اور بھے کے اگنی سے گزر گئی تھی اور اس کا بال بھی بیکا نہ ہوا تھا تو رام جی کا سر مارے شرم کے سینے کی طرف ڈھلک گیا تھا۔ اُس پل مجھے روتھ کی صورت میں سیتا دِکھائی دیں۔ پھر دونوں صورتیں ایک دوسرے میں مدغم ہوتی چلی گئیں اور دیر تک مجھے سیتا میا ہی ہر طرف دِکھتی رہیں۔
مَیں بے خبر سو رہا تھا۔ پو پھٹنے کے قریب تھی۔ مائیکل کا رِنگ ٹون سُن کر یکبارگی میری آنکھ

کھل گئی اور مَیں ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کے رونے کی آواز دو کمروں کی دوری سے آ رہی تھی۔ اُس کی خوراک کا وقت ہو گیا تھا۔ لیکن روتھ ہر صبح کی طرح بستر سے نہ اُٹھی اور نہ ہی اس نے مائیکل کے کمرے میں داخل ہو کر اُسے اُٹھایا۔ اُس کا رونا بدستور اونچے سروں میں جاری رہا۔ میرے اندر اُتھل پتھل مچتے ہی مَیں پیچ و تاب کھانے لگا۔ مائیکل کا زار زار رونا فلیٹ کے ہر حصے میں گونج رہا تھا۔ مَیں تیزی سے اُٹھا، لاؤنج کے دروازے سے ٹکرایا، مگر چوٹ اور درد کی پرواہ کیے بغیر مائیکل کے مختصر سے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ مَیں صاف صاف دیکھ سکتا تھا کہ وہ COT میں پڑا، اندھیرے میں اپنے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں چلاتے روئے چلا جا رہا ہے۔ میرے ہاتھوں میں برق سی تیزی پیدا ہو گئی اور مَیں نے بڑھ کر اُسے اُٹھا لیا۔ پھر اُس کا سر اپنے شانے پر رکھ کر اُس کی پُشت کو تھپکنے لگا۔ اس عمل کے دوران چند بول اپنے آپ میرے لبوں سے ادا ہوئے:

''بس بس میرے بچے بس۔ رومت۔ اب مَیں آ گیا ہوں۔ تیری ممی بھی آتی ہوگی۔''

اُس کا رونا قدرے کم ضرور ہوا، مگر بند نہ ہوا۔ اتنے میں کمرہ اچانک روشن ہو گیا۔ مَیں نے پلٹ کر دیکھا تو روتھ ہاتھ میں دودھ کی بوتل لیے دہلیز پر کھڑی تھی۔ سنجیدہ، مہر بہ لب، چہرہ ہر جذبے سے عاری۔ لیکن اُس کی آنکھوں کی جامد پُتلیاں صاف صاف کہہ رہی تھیں: ''بہت دیر کر دی لوٹنے میں...... سب کچھ برباد کر کے اب ہوش میں آئے ہو؟''

میرے پاس جواب دینے کو کچھ نہ بچا تھا۔ نہ کوئی دلیل، نہ کوئی منطق اور نہ ہی کوئی جواز۔ مَیں نے مسکرانے کی شعوری کوشش کی۔ لیکن میری مسکراہٹ مجھے اپنے ہی گھر میں اکیلا چھوڑ کر جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ مَیں نہیں جانتا۔ مائیکل کا رونا جاری تھا اور میرا تھپکنا بھی اور اُسے چپ کرانے کی کوشش بھی۔ مَیں نے اُسے چوم کر روتھ کے حوالے کر دیا اور آنکھیں قالین سے اُٹھائے بغیر بولا:

''صبح ڈاکٹر کو فون کر دینا۔ ہم اپنا بلڈ ٹیسٹ نہیں کرائیں گے۔''

''یہ کام تم کرو گے، مَیں نہیں؟'' اس کے لہجے میں بلا کی تلخی تھی۔

''یہ کھیل تم نے شروع کیا تھا؟...... ختم بھی تم ہی کرو گے؟''

''ہاں۔'' باریک سی آواز میرے گلے سے نکلی۔ ''یہ کام مجھ ہی کو کرنا ہوگا۔''

اور جب مَیں کمرے سے ایک ٹوٹے پھوٹے شخص کی طرح نکلا تو محسوس کر رہا تھا کہ مَیں نے اپنا پریوار ضرور بچالیا ہے، لیکن گھر گرہست میں اتنی دراڑیں ڈال دی ہیں کہ برسوں میں وہ شاید ہی مٹ پائیں؟

☆☆

یو۔ٹرن U - TURN

جوانی کی دہلیز کو پار کرتے ہی اُس نے تجارتی دنیا میں قدم رکھ لیا تھا۔ پیشہ اُس نے وہ اختیار کیا تھا جسے عوام نوادرات (ANTIQUES) کا درجہ دیتے ہیں۔ چھوٹی بڑی نایاب اشیا جو عہدِ پارینہ اور مٹی تہذیبوں سے تعلق رکھتی تھیں، انھیں وہ تلاش بسیار کے بعد پانے میں کامیاب ہوجایا کرتا۔ ملک در ملک گھومنا اُس کی کاروباری ضرورت رہا کرتی ۔ نیپال، مصر، یونان، چین، جاپان، پاکستان اور لاطینی امریکا کے گمنام اور پس ماندہ علاقوں میں اُس کے چکر اکثر لگا کرتے۔ بعض دفعہ کوئی ایسی انمول شے اُس کے ہاتھ لگ جاتی ،تو وہ اُس کے منہ مانگے دام طلب کرتا اور امیر کبیر اینٹک جمع کرنے کے شوقین ہنس کر ادا کرتے۔ بیرون ملک میں اگر کوئی ملک اُسے سب سے زیادہ پسند آیا تھا تو وہ جاپان تھا۔ گو کہ شہر ٹوکیو جدید عمارتوں کا جنگل بن چکا تھا۔ مگر وہاں کے سیانوں نے اپنی پرانی ثقافت کو یکسر مٹنے نہ دیا تھا۔ ٹوکیو کے بعض علاقوں میں پرانی اور نئی طرز کے پگوڈا موجود تھے۔ اُسے جاپانی پریوار کے ساتھ ایک رات پگوڈا میں گزارنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اُس رات اُس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ بمبئی میں اپنی مستقل رہائش کی خاطر پگوڈا

بنوائے گا، جہاں میزبان اور مہمان آمنے سامنے زمینی گدوں پر بیٹھے بلا تکلف ہم کلام ہوتے ہیں۔ طبقاتی تفریق، امارت پسندی اور معاشی درجوں کا احساس جاتا رہتا ہے۔ لہٰذا اُس نے بمبئی پہونچ کر ایک غیر آباد پہاڑی پر زمین خرید لی اور اپنے ایک قریبی دوست کو پگوڈا کا نقشہ تیار کرنے کو ہدایات دے دیں۔ پہاڑی کے نیچے کبھی شانت اور کبھی شور مچاتا سمندر تھا۔ اوپر کھلا آسمان تھا اور روح کو تازگی عطا کرنے والی بہتی ہوا تھی۔

اُس شخص کا نام ناگ ارجن ریڈی تھا۔ لیکن وہ دوستوں اور کاروباری حلقوں میں ناگی کے لقب سے جانا جاتا تھا۔ کولابہ میں اُس کا نادر اشیا سے بھرا ہوا شوروم تھا۔ لیکن اتنا کچھ پانے پر بھی وہ دنیا، عوام اور جیون سے خوش نہ تھا۔ اُسے لوگوں کی فطرت میں جب لالچ، خودغرضی، مفاد پرستی، بے ایمانی، دروغ گوئی اور دھوکا دہی نظر آتی تو اُس کی آتما رو دیتی۔ اُس نے اپنے پیارے دوستوں کی مالی امداد بھی کی تھی۔ لیکن زیادہ تر مطلب نکل جانے پر اُس سے دور ہوتے چلے گئے کہ ان کا اپنا کاروبار چل نکلا تھا اور وہ اپنی سماجی حیثیت بنا چکے تھے۔ وہ دوستوں کے دائرے میں اجنبی بنا ہر دنیاوی پہلو کو محسوس کرتا اس کے نتیجے پر پہونچا کہ عہدِ جدید میں یہی اُس کا مقدر ٹھہرا ہے۔ یوں تو اس کے پاس اب کیا نہیں تھا؟ کشادہ فلیٹ، کامیاب کاروبار، وافر بینک بیلینس، سماجی رتبہ، جائیداد اور ذہین گرل فرینڈ، جو ہر پل اس کی محبت کا دم بھرتی تھی۔ لیکن وہ وقت بے وقت بھگوان سے شکایت کرتا کہ اس نے کیسی دنیا بنائی ہے؟ کیسے لوگ بنائے ہیں؟ جو اندر سے کچھ اور ہیں اور اوپر سے کچھ؟ وہ بھگوان کے متعلق یہ وچار بھی رکھتا تھا کہ اول تو وہ ہے نہیں، مگر اس نے اپنے ہونے کا ڈھونگ اتنے مؤثر طریقے سے رچا رکھا ہے کہ ہر امیر غریب شخص اُس پر ایمان لا چکا ہے۔ اور اگر بدقسمتی سے وہ ہے بھی تو اسے کوئی احساس نہیں کہ اس کی دنیا میں، اس کے بنائے ہوئے لوگ اپنے بھائی بندوں پر کتنا ظلم ڈھاتے ہیں؟ کمزور اور نادار لوگوں کا استحصال کتنی بے دردی سے کرتے ہیں؟ بے کسوں کی زمینیں کھڑے کھڑے ہتھیا لی جاتی ہیں؟ کوئی احتجاج کرے تو اس کے بدن کے ٹکڑے چیل کوؤں کی غذا بن جاتے ہیں۔ اُس وقت پربھو کہاں ہوتے ہیں؟ ظلم کے دوران وہ طاقتور کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑ لیتے؟ اگر وہ اسے کہیں مل جائے

تو وہ بھگوان کو ایسے روح فرسا قصے سنائے کہ اسے اپنی تخلیق کردہ مخلوق کی حرکات پر شرمندگی ہو۔

ایک خوشگوار شام ناگی کام سے فارغ ہو کر گھر پہونچا۔ وہ جسمانی کم، ذہنی طور پر زیادہ تھکا ہوا تھا۔ فلیٹ میں داخل ہو کر اس نے اپنا بیگ چھوٹے صوفے پر پھینکا اور خود بڑے صوفے پر دراز ہو گیا۔ اسے خیال آیا، کاش گوری، اِس سے یہاں موجود ہوتی تو وہ اُس کی گود میں سر رکھ کر آرام کرتا اور وہ اپنے کومل کومل ہاتھوں سے اس کا سر سہلاتی۔ اتنے میں لاؤنج کا دروازہ کھلا اور ایک دیوہیکل شخص داخل ہوا۔ اس کا قد اتنا لمبا تھا کہ وہ قریب قریب چھت سے لگ رہا تھا۔ اس کا پورا بدن سیاہ چغے میں ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے سر پر عمامہ بھی سیاہ تھا۔ چوڑا چکلا سینہ اور چہرہ اس قدر بھیانک کہ اس کی جھلک پا کر کوئی بھی ہوشمند شخص اپنے حواس کھو بیٹھے۔ یہی حال ناگی کا بھی ہوا۔

وہ نووارد کو دیکھ کر اچھل پڑا اور بمشکل پوچھ پایا: ''کو کو کون ہو تم؟''

نووارد کے بھدے ہونٹوں پر کرخت سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ مگر اس نے انتہائی شائستگی سے پوچھا:

''تمہارا نام ناگ ارجن ریڈی ہے؟''

ناگی نے ڈرتے ڈرتے اثبات میں گردن ہلائی۔

''باپ کا نام کرشن ارجن ریڈی ہے؟''

''ہاں.... ہاں۔ہاں۔مگر......؟''

''میں ٹھیک مقام پر آیا ہوں۔''

''مگر مگر......تم ہو کون؟''

''ملک الموت۔''

''کیا؟......میں، میں سمجھا نہیں؟۔''

میری مشکل کو آسان کرتے ہوئے وہ بول اُٹھا۔

''عرب اور عجمی ملکوں میں مَیں اسی نام سے جانا جاتا ہوں۔ مگر بھارت والے مجھے یم دوت کہتے ہیں۔''

ناگی دہشت کے مارے پیچھے ہٹ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں گھومتی ہوئی دیواریں اندھیرے میں

ڈوبنے لگیں۔

''لیکن لیکن تم یہاں...... یہاں کیوں آئے ہو؟''

''تمھیں ساتھ لے جانے کے لیے''

''کیوں؟ میں نے کیا گناہ کیا ہے؟''

''تمھارا گناہ صرف یہ ہے کہ تم نیک اور ایماندار شخص ہو، اور کل یگ میں اِس دھرتی پر تم جیسے شریف آدمی زیادہ دیر نہیں رہا کرتے۔''

''نہیں، نہیں!'' ناگی دیوانوں کی طرح چیخ اُٹھا: میں۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ مرنا نہیں چاہتا۔''

''کمال کرتے ہو۔'' یم دوت نے حیران ہو کر کہا:

''تم روزانہ بھگوان سے شکایت کرتے رہے ہو کہ اُس نے کیسا سنسار بنایا ہے؟.... یہ دنیا تمھیں پسند نہیں، جنتا کے لچھن تمھیں پسند نہیں، ہر طرف دھوکا ہی دھوکا ہے، ظلم ہی ظلم ہے۔ کہیں کوئی سچ نہیں۔.... تمھیں تو بھگوان کا ابھاری ہونا چاہیے کہ اُس نے تمھاری سُن لی ہے۔ اب تمھیں سنسار کے مایا جال سے چھٹکارا مل رہا ہے۔''

''نہیں نہیں، ایسا نہ کہو۔ میں اپنی تمام شکایتیں واپس لیتا ہوں.... لوگ کتنے ہی ظالم، بے ایمان، خود غرض اور مطلب پرست کیوں نہ ہوں۔ لیکن میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔''

''مگر اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ ایشور کا حکم پورا کرنا میرا فرض ہے..... اِس سمے پانچ بجکر چالیس منٹ ہوئے ہیں۔ تمھاری موت ٹھیک سات بجکر پچاس منٹ پر ہوگی۔ تمھارے پاس دو گھنٹے اور دس منٹ ہیں، جتنا چاہو موج میلا کرلو۔''

ناگی کی ٹی گم ہو چکی تھی۔ اُسے پسینے بھی چھوٹنے لگے تھے۔ وہ سر سے پا تک سفید ہو چکا تھا۔ ایک گہری نظر یم دوت پر ڈال کر اُس نے بدحواسی کے عالم میں دیوار پر آویزاں ایک پینٹنگ ہٹائی۔ اُس کے پیچھے خفیہ تجوری دیوار میں جڑی ہوئی تھی۔ اُس نے لرزاں ہاتھوں سے تجوری کے نمبر مِلا کر اُسے کھولا۔ اندر ضروری کاغذات کے ساتھ نوٹوں کی گڈیاں بھی جھانک رہی تھیں۔ وہ انھیں دھڑا دھڑ یم دوت کے آگے پھینکتا چلا گیا اور ساتھ ہی ساتھ فریاد بھی کرتا رہا:

''تم یہ سب لے لو۔ سب لے لو..... پر مجھے زندہ رہنے دو.....زندہ چھوڑ دو۔''
یم دوت نے مسکرا کر ''نا'' میں گردن ہلادی۔
''تو پھر ایک کام کرو۔ میری عمر دس برس کے لیے بڑھادو۔ میں نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے؟ میں نے ابھی شادی نہیں کی، گھر نہیں بسایا، سنتان کا منہ نہیں دیکھا، دل کے ارمان پورے نہیں کیے۔''
''پربھو کے بول پتھر کی لکیر ہوتے ہیں۔ ہونی ٹلا نہیں کرتی، وہ ہو کر رہتی ہے۔.....میں سات بجکر پچاس منٹ پر آؤں گا۔۔ تیار رہنا۔''
یم دوت کے غائب ہوتے ہی وہ چیخ اُٹھا: ''نہیں، نہیں!'' اور نوٹوں کی گڈیاں اُٹھا کر کمرے سے نکل آیا۔

وہ دیوانوں کی طرح سڑک پر بھاگنے لگا۔ اُس کے پانو ڈھلتی شام میں مندر کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ بچپن میں وہ ماں باپ کے ساتھ مندر ضرور جایا کرتا تھا۔ لیکن جب سے اس کے ذاتی رویوں میں تبدیلیاں در آئی تھیں، مندر اُس کے نزدیک سراب اور امید کا ملا جُلا ادارہ تھا۔ لیکن یم دوت کا نظارہ کر کے موت کا خوف اُس پر طاری ہو چکا تھا۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ موت اُس کی طرف بڑھ رہی ہے اور اُس کے مضبوط ہاتھ اُسے بخشنے کو تیار نہیں۔ اُکھڑی اُکھڑی سانسوں سے ہانپتا ہوا وہ مندر میں داخل ہوا۔ پسینے میں تر بتر وہ زور زور سے گھنٹیاں بجانے لگا۔ کئی پجاری گھنٹیوں کا شور برداشت نہ کر کے پیچھے ہٹ گئے۔ مندر کا پنڈت بھی حیران رہ گیا۔ ناگی تیزی سے بھگوان رام کی مورتی کی طرف بڑھا اور اُن کے چرنوں سے لپٹ کر اپنی سلامتی کی خاطر گڑگڑانے لگا۔ کچھ دیر میں وہ چرنوں پر ماتھا رگڑ کر اُٹھا اور گھنٹیاں پھر سے بجا کر مندر کی سیڑھیاں اُترنے لگا۔ وہاں ہر عمر کے بھکاری بیٹھے تھے۔ ناگی نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور ہر بھکاری کو دس دس روپوں کا نوٹ تقسیم کرتا ہوا اونچے سروں میں بولا: ''میرے جینے کی دعا مانگو۔ میری لمبی عمر کی دعا مانگو۔'' حیرت میں ڈوبے ہوئے بھکاریوں میں سے ایک نے کہا:
''لیکن تم کو ہوا کیا ہے؟ تم تو بھلے چنگے ہو؟''
''نہیں نہیں۔ دو گھنٹوں بعد میری موت ہونے والی ہے۔''

ایک جوان فقیر نے زوردار قہقہہ لگایا اور نوٹ کو چوم کر کہا: ''دیوانہ ہے میری طرح۔''
دوسرے بھکاری نے بھی جملہ کسا: ''بابو روز آیا کرو۔ تم میں تو بھگوان دکھتے ہیں''
ناگی بے حد بوکھلا چکا تھا۔ اُس کے قدم غیر ارادی طور پر اپنے آپ سڑک کی طرف اُٹھ گئے۔ مندر کے سامنے برگد کے پیڑ کے نیچے اُسے یم دوت اپنے پورے وجود کے ساتھ کھڑا دکھائی دیا۔ وہ مسکرا رہا تھا، کچھ اس انداز میں کہ وہ اس کی ہر سرگرمی سے واقف ہو۔ اُس نے ناگی کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب بلایا اور طنزیہ کہا: ''دوسروں کی دعاؤں سے کام نہیں چلے گا۔''
''تو پھر مجھے کوئی راستہ بتاؤ؟ میں مرنا نہیں چاہتا۔''
تمھارے بچنے کا ایک راستہ ہے۔ پر کام کٹھن ہے۔''
''تم بتاؤ بتاؤ؟ کیا ہے وہ؟''
''کچھ دیر پہلے میں نے تمھارے بھاگیہ کی پستک میں آخری پنے دیکھے ہیں۔ تم نے جیون میں چند نیک کام بھی کیے ہیں۔ اُس میں لکھا ہے کہ تمھاری مرتیو کا سمے بیس برس تک ٹل سکتا ہے۔ اگر تم اپنے شریر کی جگہ مجھے کسی دوسرے کا شریر سونپ دو۔ مگر یہ کام تم کو اپنے ہاتھوں سے کرنا ہوگا۔''
''مطلب''
''مطلب یہ کہ اُس آدمی کا قتل تم کو خود کرنا ہوگا۔''
ناگی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کام اتنا مشکل ہوگا کہ سنتے ہی اُس کے پانو تلے سے زمین سرک جائے گی۔ مگر وہ تو زندہ رہنا چاہتا تھا ہر قیمت پر۔ اُس کے چہرے سے موت کی زردی غائب ہوتے ہی آنکھوں میں چمک اُبھر آئی اور ساتھ ہی ساتھ وہ بھکاری بھی جو اُس کی عمارت کے پیچھے جھونپڑپٹی میں رہتا تھا اور رات رات بھر کھانسا کرتا تھا۔

عمر رسیدہ بھکاری اپنے معمول کے مطابق فُٹ پاتھ پر بیٹھا، ہاتھ پھیلائے بھیک مانگ رہا تھا اور ہر آنے جانے والے سے مخاطب تھا:
''میں دھرتی پر بوجھ ہوں بابا!.....جو پیسا دے اُس کا بھی بھلا، جو نہ دے اُس کا بھی بھلا۔''
ناگی نے قریب پہنچ کر اُسے نہایت غور سے دیکھا۔ وہ ہڈیوں کا سوکھا سڑا ڈھانچہ تھا۔ ناگی کو سخت

تعجب ہوا کہ یہ آدمی زندہ کیسے ہے؟ اس کے بدن میں تو لہو کا ایک قطرہ تک نہیں؟ پورے بدن کی ہڈیاں بہ آسانی گنی جا سکتی ہیں۔ آتما شریر کو چھوڑنے پر آمادہ ہے۔ ناگی نے نوٹوں کی گڈیاں بھکاری کے آگے بڑھا دیں۔ نوٹوں کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ پھر اُن میں چمک پیدا ہوئی اور آخر کار حرکت۔ وہ نوٹوں پر جھپٹ پڑا۔ لیکن ناگی نے گڈیاں پیچھے کو کھسکا لیں:

''میں تمھیں اس سے بھی زیادہ پیسے دوں گا، مگر اس کے بدلے تمھیں مجھ کو کچھ دینا ہوگا؟

''کیا؟''

تمھارا بدن...... تمھاری موت میں میری زندگی اٹکی ہوئی ہے۔''

ہکا بکا بھکاری اس کا منہ تکتا ہی رہ گیا۔ ناگی نے اس کی سوچ کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

''ذرا سوچو تو۔ تپِ دق کا مرض تم کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ تم دنوں کے مہمان ہو...... تم یہ سودا قبول کرلو...... تمھاری بیوی بچے خوشی خوشی جئیں گے اور عمر بھر تم کو دعائیں دیں گے..... میں اتنے آرام سے تمھارا گلہ دباؤں گا کہ تم کو ذرا بھی تکلیف نہ ہوگی۔''

بھکاری کا جھریوں سے بھرا چہرہ بجھ گیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے بابو...... پن تمھارے یہ نوٹ کسی کا جیون نہیں خرید سکتے...... جان ہے تو جہان ہے...... منش کئی جنموں کے بعد جنم پاتا ہے۔ میں اپنے جیون کا سودا اپنی مرضی سے نہیں کر سکتا۔''

''تم پاگل ہو......... اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیکھو۔ وہ در در کی بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ تمھاری قربانی سے ان کا جیون سنور جائے گا۔ میں انھیں اعلیٰ تعلیم دلاؤں گا۔ تمھاری بیوی کو مکان دوں گا۔ اس کے سارے دلدّر دور ہو جائیں گے۔''

''جیون کا مالک اوپر والا ہے بابو!..... وہی جنم دیتا ہے اور وہی واپس لیتا ہے......... ان کاغذ کے ٹکڑوں سے جیون نہیں خریدا جا سکتا۔ جاؤ اپنا کام کرو......... میں دھرتی پر بوجھ ہوں بابا......''

ناگی کو لگا کہ بھکاری نے اس کے نوٹوں کے ساتھ اس کے چہرے پر بھی تھوک دیا ہے۔ غصے سے سرخ ہو کر اس کے من میں آیا کہ وہ بھکاری کو سرِ راہ ختم کر ڈالے۔ لیکن راہ گیروں کی آمد و رفت جاری تھی۔ وہ مجبور ہو کر رہ گیا۔ بے بسی کو سینے میں دبائے اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ چھ بج کر تیس

منٹ ہو چکے تھے۔اس کی روح چیخ اٹھی۔زندگی اور موت کے درمیان ایک گھنٹہ بیس منٹ رہ گئے تھے۔وہ اپنے مخلص دوست بنسالی کے مکان کی طرف بھاگنے لگا۔نقشہ نویس ہونے کے کارن وہ اس کے پگوڈا کا نقشہ تیار کرر ہا تھا۔وہ بھی اس کے مانند پینے پلانے کا دلدادہ تھا۔ہر شام سورج کے ڈوبنے پر وہ جام کے ساتھ طلوع ہوا کرتا تھا۔اس نے اپنے لاؤنج کی میز پر اسکاچ، وہسکی، سوڈا اور پانی کی بوتلیں سجا رکھی تھیں۔ایک پلیٹ میں ابلے ہوئے کابلی چنے دھرے تھے تو دوسری میں مچھلی کے تلے ہوئے قتلے۔ناگی بھاگتے بھاگتے محسوس کرر ہا تھا کہ ''وقت'' اس کی مٹھی سے پھسلا جارہا ہے اور موت کا حلقہ اس کی گردن کے اردگرد تنگ ہورہا ہے۔یم دوت کا چہرہ اس کی آنکھوں سے الگ نہیں ہو پارہا تھا۔بلکہ اب اسے بھگوان رام، کرشن، شیو اور وشنو کی مورتیاں بھی ہر سو نظر آنے لگی تھیں اور وہ اس کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھیں۔

وہ تیزی سے بنسالی کی بلڈنگ میں داخل ہوا۔لفٹ میں کھڑے اس نے ایک نظر خود پر ڈالی۔لگا کہ اس نے ابھی ابھی غسل کیا ہے۔پریشان بال بھی پسینے میں الجھے ہوئے تھے۔وہ آندھی کی طرح بنسالی کے لاؤنج میں داخل ہوا۔وہ ناگی کی غیر حالت دیکھ کر دنگ رہ گیا اور بے ساختہ پوچھ بیٹھا:

''یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟ سب خیریت تو ہے نا؟''

لیکن ناگی نے کوئی جواب نہیں دیا۔بلکہ خونخوار نظروں سے اسے گھورتا رہا۔پھر جھٹ سے ایک بوتل میز سے اٹھالی اور بنسالی کے سر پر دے ماری۔وہ دلدوز چیخ کے ساتھ فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ناگی نے تین چار مزید وار کیے۔بوتل ٹوٹ گئی اور کانچ کے ریزے گوشت میں گھس گئے۔اس کے بدن سے لہو کی دھاریں پھوٹ پڑیں۔چہرہ بھی لہولہان ہوگیا۔ناگی نے اس کی نبض ٹٹولی۔وہ دھیرے دھیرے ڈوب رہی تھی۔سانس بھی مدھم پڑ رہی تھی۔آن کی آن میں ناگی خوف، جنون اور وحشت سے آزاد ہوگیا۔راحت، سکون اور اطمینان سے اس کا چہرہ روشن ہوگیا۔اس نے باتھ روم میں جا کر ہاتھ دھوئے، بال سنوارے، لباس درست کیا اور خوش وخرم لفٹ کا انتظار کیے بغیر سیڑھیاں پھلانگتا ہوا سڑک پر آگیا۔وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی تصور کرر ہا تھا، جس کے ہاں کوئی غم،

کوئی دکھ، کوئی مسئلہ باقی نہیں رہتا۔ لیکن اس نے اچانک یم دوت کو اپنے دائیں ہاتھ پر کھڑا پایا۔
وہ اچھل پڑا اور فوراً ہی بول اٹھا:

''اچھا ہوا تم آ گئے....... میں نے اپنا کام کر دیا ہے۔ اب تو میں آزاد ہوں نا؟''

''نہیں....... کچھ دیر میں پولیس آئے گی، پھر ایمبولنس۔ وہ تمھارے دوست کو ہسپتال لے جائے گی۔ تمھارا دوست پانچ روز تک انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں رہے گا.....وہ دن رات موت سے لڑے گا۔ آخر زندگی جیت جائے گی اور تمھارا دوست پورے چھتیس برس اور سات دن بعد مرتیو پائے گا۔''

''نہیں، نہیں،'' وہ چیخ اٹھا۔ اسے لگا کہ ساری دنیا گھوم گئی ہے۔ زمین پھٹ گئی ہے اور وہ اس میں سما گیا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ کیا نہ کرے؟ ہر گزرتے پل کے ساتھ زندگی کی اہمیت اس کی نظر میں بڑھتی جا رہی تھی اور وہ دل کی گہرائیوں سے اس کی قدر کرنے لگا تھا۔ یم دوت اسے صورتِ حال سے آگاہ کر کے رخصت ہو گیا تھا۔ گھڑی کی متحرک سوئیاں اسے سخت پریشان کیے جا رہی تھیں۔ اچانک اسے گوری کا خیال آیا جو اس کی شریکِ حیات بننے جا رہی تھی اور وہ بھی جلد۔ اس کے قدم خود بخود گوری کی رہائش گاہ کی طرف اٹھ گئے۔ فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ اندھیرا مزید گہرا ہو رہا تھا۔ آکاش کا رنگ بھی بدل رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے نا گی محسوس کر رہا تھا کہ اندھیرا ابھی موت بنتا جا رہا ہے اور وہ اسے زندہ نگل جائے گا۔ مگر وہ ہمت ہارنے کی بجائے اندھیرے کو چیرتا ہوا فوراً اپنی منزل پر پہونچ جانا چاہتا تھا۔ اُسے دوٗر سے گوری کا مکان دکھائی دیا۔ اسے خود پر مکمل یقین تھا کہ وہ اپنے مقصد میں سرخ رو ہو کر رہے گا۔ اس لیے کہ گوری فطرتاً نرم دل واقع ہوئی ہے۔ طبعاً معصوم ہے۔ پھر اس سے والہانہ عشق بھی کرتی ہے اور اس کے ہر کہے کا احترام بھی۔ یہ خیالات اس کے دماغ سے گزر رہے تھے کہ اس کے اندر سے کوئی بولا:

''یو باسٹرڈ! تم اتنے خود غرض تو کبھی نہ تھے؟ بلکہ خود غرض لوگوں سے تم سدا نفرت کرتے رہے.... مگر اب اپنی غرض کی خاطر اس بھولی بھالی عورت کو تم موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے ہو، جسے تم اپنی ذات سے زیادہ پیار کرتے رہے ہو؟ ......لعنت ہے تم پر۔''

مگر شعور نے ضمیر پر تازیانہ برسا کر جواباً کہا:
''تمھاری ہر بات اپنی جگہ صحیح ۔ لیکن اگر وہ چل بسا تو ساری کائنات اس کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ اگر زندہ رہا تو ایک گوری کیا، پچاسوں گوریاں کالیاں اسے نصیب ہو جائیں گی۔ اس کے پاس کیا نہیں ہے؟ دولت، عزت، رتبہ، جوانی۔''

گوری دوردرشن کا کوئی چینل دیکھ رہی تھی۔ اس کے چھوٹے بہن بھائی بھی وہاں موجود تھے۔ پروگرام دلچسپ تھا۔ ہر کوئی اس میں کھویا ہوا تھا۔ کسی کو ناگی کی آمد کا احساس ہی نہ ہوا کہ گھر کے ملازم نے کب اس کے لیے دروازہ کھولا اور کب وہ دبے پانو کمرے میں داخل ہوا۔ گوری ناگی کی وحشت ناک حالت دیکھ کر گمان بھی نہ کر سکتی تھی کہ وہ اس قدر پریشان اور حواس باختہ ہوگا کہ اسے پہچاننا مشکل ہوگا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ مگر ناگی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ دروازہ بند کرنے پر وہ کھڑکیاں بھی بند کرتا چلا گیا۔ گوری اس کی حرکات کو مطلق سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بول اٹھی:
''یہ تم کیا کیے جا رہے ہو؟''
لیکن ناگی کھڑکیاں بند کرنے میں مصروف رہا۔
''تم اتنے پریشان کیوں ہو؟ بے حد گھبرائے ہوئے بھی ہو، آخر بات کیا ہے؟''
''کچھ نہیں۔'' اس نے خود پر قدرے قابو پا کر کہا:
''ہمیں بنسالی کے ہاں جانا ہے۔''
''بنسالی کے ہاں؟''
''ہاں! پگوڈا کا نقشہ تیار ہو گیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ گوری کے ساتھ شام میں چلے آؤ۔ وہ نقشہ دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔''
''لیکن......؟''
''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ صبح اس نے فون پر بتایا کہ نقشہ تیار ہے۔ شام میں گوری کے ساتھ آؤ اور کھانا بھی یہیں کھاؤ۔ اب اگر تم نہ گئیں تو وہ بُرا مان جائے گا۔''

گوری ناگی کی فطرت سے خوب خوب واقف تھی۔ جانتی تھی کہ وہ جس بات پر اڑ جائے، اسے پورا کر کے ہی دم لیتا ہے، خواہ دنیا اِدھر سے اُدھر کیوں نہ ہو جائے۔ لیکن وہ اپنا کہا آخری لفظ گردانتا ہے۔

ٹیکسی کولتار کی چکنی سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں سات اور چھ کے ہندسوں پر پہنچ چکی تھیں۔ صرف انیس منٹ ناگی کی موت کے درمیان بچ رہے تھے۔ اسے شدید ذہنی جھٹکا لگتے ہی محسوس ہوا کہ اس کے دماغ کی کوئی رگ پھٹ جائے گی اور وہ مقررہ وقت سے پہلے ہی دم توڑ دے گا۔ اس نے ڈرائیور سے رفتار بڑھانے کو کہا۔ ڈرائیور نے ایکسی لیٹر دبایا تو پہیوں کی رفتار زن سے بڑھ گئی اور ٹیکسی شہر کی مرکزی حدود سے نکل کر سنسان علاقے کی طرف دوڑنے لگی۔ گوری نے گھبرا کر چھوٹتے ہی پوچھا:

''یہ تم مجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟''

''پہلے میں تمھیں وہ جگہ دکھانا چاہتا ہوں، جہاں پگوڈا بنا کر ہم شادی کے بعد رہیں گے اور ہمارے بچے پہاڑی پر دوڑتے بھاگتے پھریں گے۔''

گوری شرما کر دوہری ہو گئی۔

ٹیکسی پہاڑی کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ ناگی گوری کا ہاتھ تھام کر پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ اندھیرا رات کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سمندر کا شور جاری تھا۔ لہریں کناروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ پہاڑی سے چند فرلانگ کی دوری پر لائٹ ہاؤس تھا۔ اس کی جلتی بجھتی روشنی اور گرد و پیش کے رومانی ماحول سے گوری کا دل مچل گیا تھا۔ وہ نیچے بہتے ساگر کو دیکھ کر اتنی خوش ہوئی تھی کہ اس نے ناگی سے برجستہ کہا:

''تم نے پگوڈا کے واسطے کمال کی جگہ تلاش کی ہے۔ تمھاری پسند کا جواب نہیں ..... چلو اب بنسالی کے گھر چل کر نقشہ دیکھتے ہیں؟''

لیکن ناگی کے کان اس کی آواز کی طرف متوجہ نہ تھے۔ اس کی آنکھیں گھڑی پر مرکوز تھیں۔ صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ ناگی کا دل اتنی تیزی سے اوپر نیچے ہوا کہ اسے لگا، وہ اگلے ہی پل سینے سے

نکل کر زمین پر پھیل جائے گا۔ وہ گوری کو پہاڑی کے سرے پر لے آیا۔

"وہ دیکھو لائٹ ہاؤس۔ اس کی گھومتی سرخ روشنی جب پانی کی سطح پر پھیلتی ہے تو لگتا ہے کہ سمندر کا خون ہو گیا ہے۔"

گوری خون کے نام پر چونک اُٹھی۔ خوف سے پیچھے ہٹ کر ناگی کو محتاط نظروں سے دیکھنے لگی۔ لیکن ناگی نے بڑھ کر پیار سے اس کی گردن پر ہاتھ پھیر کر کہا:

"کیا تم اپنی ہر انمول شے میرے لیے قربان کر سکتی ہو؟"

"بے شک۔ عورت کی اس سے بڑھ کر خوشی کیا ہو گی کہ وہ اپنے پریمی کی خاطر خود کو بھی قربان کر دے۔ بولو کیا مانگتے ہو؟"

"تمھاری سب سے قیمتی شے۔ تمھاری جان ...... تمھاری آتما؟"

گوری کی ملائم گردن ناگی کے مضبوط ہاتھوں میں تھی۔ لیکن وہ ہرنی کی طرح قلانچ بھر کر اس کے ہاتھوں سے پھسل گئی۔ اسے ناگی کے خطرناک ارادوں کا کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا۔ وہ خوف سے لرزاں پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ لیکن ناگی نے پھر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

"تمھاری موت سے مجھے دوبارہ جیون مل سکتا ہے .... اگر تم نے انکار کیا تو تین منٹ بعد یم دوت میری آتما کو لے اڑے گا...... پھر تم جیون بھر میرے لیے آنسو بہانا؟"

"مانا میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں .... پر میں تمھارے واسطے اپنے جیون کا بلیدان کیوں دوں؟ .... تم نے آج تک دنیا کو نہیں سمجھا؟ تم بھگوان کو نہیں مانتے؟ تمھارا کوئی آدرش نہیں، کوئی مقصد نہیں؟ تم قدرت کی ہر خوبصورت شے کی بھی تعریف نہیں کرتے؟"

"یہ بحث کا نہیں، فیصلے کا وقت ہے۔"

اس کے ہاتھ گوری کی گردن کو کستے چلے گئے۔ لیکن گوری نے رہی سہی طاقت کو مجتمع کیا اور دم توڑتی آواز میں بمشکل کہا:

میری بہت سی آرزوئیں ہیں...... سب سے بڑی آرزو ماں بننا ہے...... عورت اُس کے بنا مکمل نہیں ہو......"

لیکن ناگی نے جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی اس کا گلہ پوری طاقت سے گھونٹ ڈالا۔ گوری بُری طرح سے ہاتھ پانو چلانے لگی۔ لیکن اس کی آنکھیں باہر کو نکلتی چلی آئیں اور وہ نیم مردہ حالت میں ہچکیاں لینے لگی۔ ناگی خوش تھا کہ وہ جلد ہی اپنی منزل سے ہم کنار ہونے والا ہے۔ مگر گوری کی جسمانی جدوجہد جاری تھی۔ دھکم پیل کے دوران ناگی کے پانو تلے سے ایک پتھر کھسکا اور وہ اپنا توازن کھو بیٹھا۔ اس نے خود کو سنبھالنا چاہا، مگر وہ گوری کے ساتھ زمین پر گر گیا۔ دونوں لپٹے ہوئے پہاڑی کے سرے کی طرف بڑھنے لگے۔ گوری لڑھکتی ہوئی ایک گھنی جھاڑی میں اٹک کر رہ گئی، جبکہ ناگی لُڑھکتا لُڑھکتا کنارے سے ہو کر چٹانوں سے ٹکراتا سمندر میں جا گرا۔ ایک بھیانک دلدوز چیخ فضا میں اُبھری۔

اُس وقت شام کے ٹھیک سات بج کر پچاس منٹ ہوئے تھے، اور یم دوت پہاڑی کے سرے پر بازو پھیلائے کھڑا تھا۔

☆☆

چتری والا کیلا

گرمی برداشت سے باہر تھی۔ میرے شریر پر صرف انڈر رویر ہی تھا۔ اُسے پہنے ہوئے میں گھر میں پوری آزادی کے ساتھ گھوم پھر رہا تھا۔ وہ فلیٹ میرے ایک دوست کا تھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں۔ لیکن ہوا نے بغاوت کر رکھی تھی۔ جانے کیوں؟ کچن میں داخل ہوکر میں نے فریج کھول کر بیئر کی بوتل یا کوکا کولا تلاش کیا، لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ سخت کوفت ہوئی۔ فریج کا دروازہ بند کر ہی رہا تھا کہ نظر فریج میں رکھی ایک کتاب پر پڑی۔ چونک اُٹھا، اِس حد تک کہ مجھے اپنے دوست کی ذہنی صحت پر شُبہ ہونے لگا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کتاب فریج میں پڑی ٹھنڈی کیوں ہو رہی ہے؟ وہ دوست میرے بہترین دوستوں میں سے تھا۔ پیشے کے اعتبار سے جرنلسٹ تھا۔ Fleet Street کا ہر نیا پُرانا جرنلسٹ اُس کا احترام کرتا تھا اور اُس کی بے باکی کا قدردان بھی تھا۔ انگلستان کا ہر اخبار اُسے اپنے عملے میں شامل کرنے کو تیار تھا، بشرطیکہ وہ اپنی سوچ اور رویّوں میں کچھ لچک پیدا کر لے؟ لیکن وہ بذاتِ خود ایک ٹیڑھا سوال تھا۔ ''مارننگ اسٹار'' جیسے اشترا کی اخبار میں کم تنخواہ پا کر بھی، بے تھکان کام کیے جا رہا تھا۔ اُس نے مختصر سے عرصے میں چند ایسے ریڈیکل

مضامین رقم کیے تھے کہ لیبر، ٹوری، اور لبرل پارٹی کے مشاق سیاسی لیڈران بھی اُس کو انٹرویو دینے سے آنا کانی کیا کرتے تھے۔ خلیجی جنگ ۲ کے دوران، جن دنوں عراق پر جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے اور دوسری طرف امریکہ اور برطانیہ اقوام متحدہ میں عراق پر حملہ کرنے کی قرارداد پاس کرانے کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے تو ڈینی نے امریکہ اور برطانیہ کے خلاف یہاں تک لکھا تھا کہ وہ کیمیائی، نیوکلیائی اور حیاتیاتی ہتھیاروں کی آڑ لے کر عراق پر حملہ کرنا چاہتے ہیں اور اُسے برباد کر کے اُس کا تیل ہتھیانا چاہتے ہیں۔ لیکن اقوام متحدہ میں قرارداد منظور نہ ہونے کے باوجود جب اتحادی فوجوں نے عراق پر جارحانہ حملہ کر ڈالا تو ڈینی نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو مخاطب کرتے ہوئے ایک مضمون لکھا، جس کا لب ولباب تھا۔

"کیوں نہ اقوامِ متحدہ کی عالیشان عمارت کو ایک عالمی قحبہ خانہ میں تبدیل کر دیا جائے۔ اِس لیے کہ اب اُس ادارے کی اپنی کوئی اہمیت نہیں رہی اور نہ ہی اب وہ کسی کام کے لیے بچ رہا ہے۔ مناسب یہی ہوگا کہ اُس عمارت میں ایک سو ساٹھ (۱۶۰) مُلکوں کی حسین ترین عورتیں بٹھا دی جائیں اور اُن کی آمدنی کا پورا حساب کتاب سیکرٹری جنرل رکھے کہ اب یہی نوکری اُس کے واسطے بچ رہی ہے"۔

اُس کا پورا نام ڈینیل ڈگلس تھا۔ مگر وہ ڈینی کے لقب سے ہی جانا جاتا تھا۔ اُس شام ڈینی کے گھر لوٹنے سے پہلے میں نے بیئر کے چند ڈبے لا کر فریج میں ڈال دیئے تھے۔ وہ قدرے دیر سے آیا تھا۔ مگر وہ اکیلا نہیں تھا، اُس کی ہسپانوی گرل فرینڈ بھی اُس کے ساتھ تھی، جس کے ساتھ اُس کا عشق گذشتہ آٹھ برسوں سے جاری تھا۔ دونوں جب ایک دوسرے سے تھک جاتے یا اوب جاتے تو دو تین ہفتوں کے لیے دور رہ کر صرف فون سے ہی رابطہ رکھتے۔ لیکن جب ملنے کی گھڑی آتی تو کچھ اِس انداز سے ملتے کہ زندگی کی ہر خوشی اُن کو مل گئی ہے۔ اُس کی گرل فرینڈ کا نام لالی پا کو تھا۔ سرو قد، واجبی چہرہ، مگر آنکھیں ہر دم سُرخ۔ لگتا تھا کہ وہ مرنے مارنے پر تلی بیٹھی ہے۔ دراصل وہ بلڈ پریشر اور مائی گرین کی دائمی مریضہ تھی۔ لیکن اِس کے باوجود اُس کا ہاتھ وائن کے گلاس سے الگ نہ ہوا کرتا تھا۔ وائن کوئی بھی ہو۔ سُرخ، سفید یا روزے۔ وہ کبھی انکار نہ کرتی اور نہ ہی نشے

میں چور اپنا گلاس اُٹھا کر الگ سے رکھ چھوڑتی۔ وہ ہسپانوی سفارت خانے میں برسوں سے کام کر رہی تھی۔ انگریزی زبان فرفریوں بولتی، گویا وہ اُس کی مادری زبان رہی ہو۔ لیکن اپنے بچوں کے ساتھ انگریزی کم، ہسپانوی زبان زیادہ بولا کرتی تھی۔ طلاق شُدہ تھی۔ دو بچے بھی تھے۔ کورٹ نے بچوں کی پرورش کا فیصلہ اُس کے حق میں سنایا تھا اور جب وہ کورٹ سے نکل کر باہر آئی تھی تو اُس نے فخریہ اپنے بلاوز کے بٹن کھول ڈالے تھے۔ فوٹوگرافرز نے اُس کی کئی تصویریں کھینچی تھیں، جو اگلے روز نمائندہ اخباروں میں جلی حروف کے ساتھ شائع ہوئی تھیں۔ ''مردوں کی دُنیا میں جب عورت کسی مرد کو شکست دیتی ہے تو وہ اپنے بلاوز کے بٹن کھولنے سے بھی پیچھے نہیں ہٹتی''۔

وہ لوگ فلیٹ میں داخل ہوئے تو میں بیئر کے چند ڈبے صاف کر چکا تھا اور بڑے صوفے پر دراز خراٹے بھر رہا تھا۔ اُن کی آہٹ پر جب میں بیدار ہوا تو وہ میری درویشانہ حالت کو دیکھ کر ہنس دیئے اور محظوظ بھی ہوئے۔ میز پر خالی ڈبوں کے درمیان وہ کتاب بھی پڑی تھی۔ ڈینی نے وائن کی بوتل کھولی اور پا کو کو گلاس بنا کر دیا اور خود بیئر پینے لگا۔ گلاس ٹکرانے پر میں اُس سے پوچھ بیٹھا:

''یہ کتاب فریج میں پڑی تھی؟ شاید تم جلدی میں اُسے وہاں چھوڑ گئے تھے؟''

''نہیں تو۔'' وہ ہنس دیا۔ اُسکی ہنسی اکثر گمراہ کن ثابت ہوا کرتی تھی۔ ''ایسا نہیں ہے۔ گرمی بہت تھی۔ گھر میں نہ تو بیئر تھی اور نہ ہی کوئی لیمن ایڈ یا کوک۔ سوچا، اِس کتاب سے ہی تم دل بہلاؤ؟ وتسائن تمہارا پسندیدہ ادیب ہے؟''

''مگر اِس کو تم میز پر بھی چھوڑ کر جا سکتے تھے؟''

''تم بھی نرے اسٹوپڈ ہو۔ اِس کتاب کا ٹائیٹل تو پڑھا ہوتا۔ The Origions of Sex ....سیکس تمہارا پسندیدہ موضوع رہا ہے اور میدان بھی۔ تم کام سوترا اور کھجراؤ کی مورتیوں پر اتھارٹی جو ہو۔ سوچا، کتاب فریج میں پڑی رہے گی تو اِس موسم میں کچھ ٹھنڈک دے گی۔''

اِس پر لاؤنج میں وہ قہقہہ پڑا کہ بس خدا کی پناہ۔ مگر بات یہاں ختم نہ ہوئی۔ بولا: ''تم اکثر کہا کرتے ہو، عورت کا خوبصورت جسم دیکھ کر زندگی کا اعتبار بڑھتا ہے''۔

''یہ خیال میرا نہیں، کسی عرب شاعر کا ہے۔''

''ایک ہی بات ہے۔'' پاکو نے بھی گفتگو کا مزہ لیتے ہوئے کہا: ''تمہارا دعویٰ یہ بھی ہے کہ عورت خدا کا نایاب تحفہ ہے۔ جو مرد کے لیے اُس نے تخلیق کیا ہے؟''

''ہاں، یہ سب باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے میز سے کتاب اُٹھائی اور اُونچے سروں میں بولا: ''مگر اِس کو فریج میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟'' اور میں نے کتاب میز پر پٹک ڈالی۔

اُنھوں نے زور کا قہقہہ لگایا۔ انجام کار میں بھی شرمندہ سا اُن کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ پاکو میرا سانولا یا بدن اور اُس کے سکڑتے پھیلتے پٹھوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے بانہوں سے اپنا سینہ ڈھانپنا چاہا تو میرے بازوؤں اور کندھوں کی مچھلیاں پھڑک اُٹھیں۔ پاکو کی تیز نظریں میرے اندر اُتری جا رہی تھیں۔ میں تُرنت اپنی جگہ سے اُٹھا اور کمرے میں جا کر ڈینی کا گاؤن اوڑھ کر واپس لوٹ آیا۔ ڈینی نے پاکو سے طنزیہ کہا:

''رتن ڈر گیا ہے۔ کہیں تم اُسے کھڑے کھڑے seduce نہ کر ڈالو؟''

نوٹنگ ہل گیٹ کی سیکسن ڈرائیو میں، جس ون بیڈروم فلیٹ میں میرا قیام تھا، اس کا چار ہفتوں کا کرایہ میرے ذمے تھا اور میں پریشان تھا۔ پچھلے تین ماہ سے میرا پیغمبری دور چل رہا تھا۔ میں اپنے چند قریبی دوستوں سے منہ بھی چھپاتا پھرتا تھا۔ گو وہ پیسوں کا تقاضا یکسر نہ کیا کرتے تھے کہ ہر کوئی مالی اعتبار سے آسودہ تھا اور میرے حالات سے بھی واقف تھا۔ مگر میں اُن سے ملنے سے ہچکچاتا تھا۔ لینڈ لارڈ کا تقاضا بھی اپنی جگہ صحیح تھا اور میں جانتا تھا کہ میرے رہنے کی جگہ میرے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے اور میں کسی روز بھی سڑک پر آ رہوں گا۔ میرا آخری سہارا سوشل سیکورٹی تھا۔ اُس ادارے کا دفتر میرے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ لیکن وہاں داخل ہونے پر میرا ضمیر ایسے ایسے سوال پوچھا کرتا کہ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑتا تھا۔ کبھی کبھار ایسا لگتا کہ میں شہر ممبئی کے کسی ڈھابے کے باہر، بھکاریوں کی قطار میں فٹ پاتھ پر بیٹھا اس سخی آدم کا انتظار کر رہا ہوں، جو ادھر سے گزرتا ہوا میرا دوزخ بھر دے گا۔ اور کبھی لگتا کہ میں انگلینڈ میں آباد ہو کر بھی دانے پانی کا محتاج

ہی رہا۔ اور اب سوشل سیکورٹی کے دفتر میں بیٹھا بھیک کا طلب گار ہوں۔ پھر سب سے بڑی بات جو مجھ کو وہاں جانے سے روکا کرتی تھی، وہ میرا چھوٹا موٹا فلم اسٹار ہونا تھا۔ میں فلموں اور ٹیلی ویژن کی کئی سیریل میں مختصر اور اہم رول ادا کر چکا تھا۔ میرا چہرہ جانا پہچانا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ شام کے اخبار میں میری تصویر اِس سُرخی کے ساتھ شائع ہو۔

" ASIAN FILMSTAR SEEN IN DOLE QUEUE "

موسم گرما کی ایک ڈھلتی شام تھی۔ میں اور میری گرل فرینڈ ایملی پب کی رونق بڑھا کر وہاں سے چلے آئے تھے۔ ہائی اسٹریٹ سے ہم نے کھانے پینے کا کچھ سامان خریدا اور اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھنے لگے۔ اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ ویک اینڈ کا آغاز تھا۔ پبوں کے باہر بھی لوگ کھڑے پی پلا رہے تھے۔ میں ایملی کی کمر میں ہاتھ ڈالے اُس کو سنبھال رہا تھا کہ اُس کے قدموں میں ہلکی سی لغزش چلی آئی تھی اور بول چال میں لکنت کا عنصر بھی پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن اُس کے بھاری بھرکم بدن کو سنبھالنا اِتنا آسان نہ تھا۔ اُس کی مضبوط کاٹھی اپنی ماں پر گئی تھی۔ دوہری پسلی، بھرے بھرے کولہے اور بازو۔ صاف رنگ، لیکن نین نقش ایک ویسٹ انڈین عورت کی طرح۔ پھیلی ہوئی ناک، اُبھرے ہوئے گال اور ستم بالائے ستم چہرے کی سفید جلد پر باریک تِل نُما کالے اور خاکستری داغ۔ میں اور وہ جب مذاہب اور قوموں کو بالائے طاق رکھ کر بدنوں کی آزادانہ پکار سنا کرتے تو ایک رات، میں نے اُسے ہتھکڑی پہنا کر اپنے آہنی پلنگ سے باندھ رکھا تھا۔ اور وہ یکسر میرے رحم وکرم پر تھی۔ میں نے بڑی نفاست سے اُس کے چہرے پر پھیلے ہوئے سیاہ اور خاکستری نکتوں کو چھوا اور اپنے مخصوص انڈین لہجے میں کہا:

''کیا تم جانتی ہو، تم کیا ہو؟''

وہ اِس غیر متوقع سوال کے واسطے بالکل تیار نہ تھی۔ حیرت سے تکتی رہی۔

''تم ایک چتری والا کیلا ہو۔''

کمرے میں ہتھکڑیوں کی جھنجھناہٹ بھرپور طریقے سے ہوئی اور وہ احتجاجاً خود کو آزاد کرانے کے درپے ہاتھ پاؤں دیوانہ وار چلانے لگی۔ مگر بے سود۔ اُس کے پاؤں آزاد ضرور تھے۔ مگر ہاتھ

الگ الگ ہتھکڑی میں جکڑے پلنگ کی موٹی سلاخ سے بندھے ہوئے تھے۔ میں ہنستا کھیلتا اُس کی کیفیت سے محظوظ ہوتا رہا۔ وہ مجھ کو چار حرفی گالیاں دیتی رہی اور کوئی بھی گالی ایسی نہ بچ پائی تھی، جو اُس کے موٹے موٹے لبوں پہ اُبھری نہ ہو۔ میں ہر گالی کی گہرائی میں اُتر کر خوش ہوتا رہا کہ اُس کا بدن متواتر بستر پر چھلانگیں لگاتا جارہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ آخرش میں نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے بدن پر قابو پالیا اور اُس کے ادرکی بالوں کو سہلا کر اور اُس کے ماتھے کو چوم کر اور اُس کو اپنے پیار کا پورا یقین دلا کر کہا: ''ہماری زبان میں اُس شخص کو چتری والا کیلا کہتے ہیں...اور آج سے میں تم کو صرف چتری کہوں گا۔''

میں نے ہتھکڑی کی چابی، جو اُس کی دائیں پسلی اور پستان کے درمیان بستر پر پڑی تھی، اُٹھا کر ہتھکڑیاں کھول دیں۔ بس پھر کیا تھا۔All Hell Broke Loose۔وہ شیرنی کی طرح مجھ پر لپکی اور مجھ کو کچا چبا جانے پر اُتر آئی۔ لیکن میری ہنسی جوں کی توں برقرار رہی اور میں ان لمحوں کا لطف اُٹھاتا رہا۔ وہ غصے سے اِس قدر پاگل ہو چکی تھی کہ اُس نے تپائی پر رکھی ہوئی رم کی بوتل اُٹھا کر میرے سر پر پھوڑنا چاہی۔ میں نے لپک کر اُس کا ہاتھ تھام لیا اور سنجیدگی سے کہا:

''ایسا غضب مت کرنا۔ ورنہ شام غارت ہو جائے گی۔''

وہ بھی میری طرح پینے پلانے کا شوق رکھتی تھی۔ خاص طور پر جیمکن رم تو اُس کی ہر موسم میں کمزوری رہی تھی۔ اُس نے بارہا اپنی ماں سے، اُس کا مُدتوں پہلے کا چھوڑا ہوا دیش جیمکا دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ لیکن ہر برس اُس کی ماں اُسے یہ کہہ کر ٹال دیا کرتی کہ اگلے برس وہ یقیناً وہاں جائیں گے۔ پھر وہ اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں سے جی بھر کر ملے اور چاہے تو وہاں شادی کر کے شوہر کو بھی ساتھ لے آئے۔ مگر وہ اگلا برس کبھی نہ آیا اور چتری ماں کو بُرا بھلا کہہ کر خاموش ہو جاتی۔ وہ بھی اپنی ماں کی طرح آزاد عورت تھی۔ برسرِ روزگار۔ بلڈنگ سوسائٹی میں ملازمہ تھی۔ وہ بھی میری طرح فلیٹ رکھتی تھی۔ لیکن فرق اِتنا تھا کہ اُس نے اسٹوڈیو فلیٹ خرید رکھا تھا اور میں ہر آٹھ دس ماہ کے بعد کرائے کا فلیٹ بدلتا رہتا تھا۔ اب وہ ایک بیڈروم فلیٹ خریدنے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔ اِس لیے کہ اسٹوڈیو فلیٹ میں Privacy نام کی کوئی شے باقی نہیں رہتی۔ کمرے کے

ایک کونے میں کچن ہے تو دوسرے میں باتھ روم۔ پھر وہاں بیٹھے ہر شخص کی اُلٹی سیدھی حرکت دوسرے سے ڈھکی چھپی نہیں رہتی۔ اُس نے اپنا فلیٹ نہایت ہی خوبصورت ڈھنگ سے سجا رکھا تھا۔ سفید الماری کے ایک پٹ پر اپنی ماں کی تصویر کے گرد اپنے پانچ سوتیلے بہن بھائیوں کی تصویریں ایک دائرے کی صورت میں سجا رکھی تھیں۔ لیکن سب سے چھوٹی بہن نیشا کی فریم شدہ تصویر الگ سے ڈریسنگ ٹیبل پر بھی رکھی تھی وہ تین سالہ معصوم بچی چتری کو جان کی حد تک عزیز تھی۔ کوئی کوئی ویک اینڈ وہ نیشا کو اپنی ماں کے گھر سے اپنے ہاں لے آیا کرتی۔ وہ بھی بڑی بہن کی صحبت میں انتہائی خوش رہتی۔ اُسے بہترین کھانوں کے ساتھ لاڈ پیار، گھومنا پھرنا اور رُخصت ہوتے وقت چاکلیٹ اور بسکٹوں کے ڈبے بھی ملتے۔

چتری گنگنا رہی تھی اور میں اُس کو سنبھالے اپنی رہائش گاہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کینٹکی فرائڈ چکن (KFC) کے ڈبے اُس نے تھام رکھے تھے، جبکہ وائن کی بوتل میری بغل میں تھی۔ ہم خراماں خراماں بڑھ رہے تھے۔ سیکسن ڈرائیو شروع ہو چکی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف یکساں طرز کی دومنزلہ عمارتیں کھڑی تھیں۔ اُونچے اُونچے زینے اور اُونچی اُونچی چھتیں۔ کمرے بھی کسی زمانے میں جہازی رہے ہوں گے۔ مگر لینڈ لارڈ بڑے شاطر تھے۔ ہر کسی نے ہر منزل کے کمروں کو کاٹ واٹ کر مختصر فلیٹ اور بیڈ سٹر میں منتقل کر دیا تھا۔ میرا لینڈ لارڈ شاطر ہی نہیں، مہا شاطر تھا۔ دھیرو بھائی پٹیل مذہبی اعتبار سے پکا ہندو تھا۔ مگر تجارتی اعتبار سے وہ انگریزوں اور یہودیوں سے بھی نمبر لے گیا تھا۔ وہ افریقہ کے ملک یوگینڈا سے صدر امین کے نکال دینے پر، اپنے خاندان کے ساتھ لُٹ لٹا کر یہاں آیا تھا۔ مگر اب وہ کئی عمارتوں کا مالک تھا۔ ایک تین ستارہ ہوٹل بھی اُس کی ملکیت میں شامل تھا۔ اُس کی سبھی عمارتیں کرائے داروں سے اٹی پڑی تھیں۔ لیکن کارواں کو چلانے کے لیے کارندوں کی ضرورت ہمیشہ سے رہی ہے۔ دھیرو بھائی نے بھی چند باؤنسر (Bouncer) پال رکھتے تھے۔ ہٹے کٹے، لمبے اُونچے۔ کوئی شخص وقت پر کرایہ نہ دیتا یا کمرہ خالی کرنے سے انکار کرتا تو باؤنسر اُس کا سامان اُٹھا کر سڑک پر پھینک آتے۔ کوئی پرزور احتجاج کرتا تو باؤنسر اُس کے چہرے پر اُلٹے سیدھے نشان بھی چھوڑ دیتے۔ لیکن دھیرو بھائی میرا لحاظ ضرور

کرتا تھا کہ میں اُس کا واحد ایشیئن کرائے دار تھا۔ پھر میں انڈین بھی تھا اور اُس کا ہم مذہب بھی۔ مگر مجھ کو اُس کی طاقت کا احساس ہمیشہ سے تھا۔ اور ساتھ میں باؤنسروں کا خوف بھی۔ جانے کب میرا سامان سڑک پر ہو اور میرا خوبصورت چہرہ جو میری زندگی کا کل سرمایہ تھا، اگر بگڑ گیا تو دال روٹی سے بھی جاؤں گا؟

عمارت کا دروازہ کھول کر میں اور چتری سیڑھیاں طے کرنے لگے۔ میرا فلیٹ دوسری منزل کے آخیر میں تھا۔ ہم گنگناتے ہوئے جب اپنے دروازے پر پہونچے تو دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ میرا سامان دروازے کے باہر رکھا میرا منہ چڑا رہا ہے۔ تالے بدل دیئے گئے تھے۔ دروازے کے عین وسط میں ایک رُقعہ جلی حروف میں چسپاں تھا۔

''رتن کمار۔ اگر تم کوئی ماسٹر چابی رکھتے ہو تو نیا تالہ ضرور کھل جائے گا۔ مگر اُس صورت میں حوالات کا دروازہ وا ہو جائے گا۔ دوسری بات، اگر تم نے پولیس یا قانون کا سہارا لیا تو اپنے گرد آتش بازی کی آوازیں جلد پاؤ گے''۔

میں مکمل بدحواس ہو چکا تھا۔ کبھی سامان کو دیکھتا، کبھی نئے تالے کو اور کبھی چتری کو، سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اِن حالات میں کیا کروں؟ لیکن چتری مجھ سے زیادہ سیانی تھی اور دلیر بھی۔ وہ کچھ سوچ کر دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی اور مجھے بھی ویسی ہی پوزیشن اپنانے کو کہا۔ پھر اُس نے سرگوشی کرتے ہوئے گوش گزار کیا کہ وہ ''ایک دو تین'' کہنے پر اپنی پوری طاقت کے ساتھ دروازے کو دھکا دے گی اور میں بھی ویسا ہی عمل اختیار کروں۔ پہلی بار ہم دروازے پر حملہ آور ہوئے تو اُس کا کچھ بھی نہ بگڑا۔ لیکن چتری ہمت ہارنے والی نہ تھی۔ اُس نے اونچا اونچا گانا شروع کر دیا اور اُس کی آڑ میں پے در پے اپنے وزنی بدن سے دروازے کی چولیں ڈھیلی کرنے لگی۔ میں بھی برابر اُس کا ساتھ دیئے جا رہا تھا۔ بریکٹ طاقتور بدنوں کا زیادہ دیر مقابلہ نہ کر پائی تھی۔ میں اپنا پورا سامان اُٹھا کر فلیٹ میں پرولیش کرنا چاہتا تھا۔ مگر چتری نے مجھے روک کر اشارۃً کہا کہ میں اپنا ضروری سامان ہی اندر لے کر جاؤں۔ بقیہ سامان باہر ہی رہنے دوں کہ لینڈ لارڈ اور اُس کے گشت کرتے حواریوں کو احساس ہو کہ تم نے کوئی نازیبا حرکت نہیں کی ہے۔

وہ رات ہم نے تین چوتھائی اندھیرے میں کاٹی تھی اور ایک چوتھائی چاند کی مدھم روشنی میں، جو کھڑکی سے ہم تک پہونچ رہی تھی۔ میں بار بار اُس کا ماتھا اور ترشے ہوئے ادرکی بالوں کو چوم رہا تھا کہ وہ اکثر میرے آڑے وقتوں میں کام آیا کرتی تھی۔ میں اُس کو اپنا نجات دہندہ بھی تصور کرتا تھا۔ میرا عمل جاری تھا کہ وہ بول اُٹھی۔

''یہ رات تو بیت ہی جائے گی۔ مگر کل....؟''

''کل کی کل دیکھیں گے۔''

کہنے کو تو میں نے یہ کہہ دیا تھا۔ لیکن حقیقت میرے سامنے کھڑی میرے دل و دماغ پر منڈلا رہی تھی اور میں خاصا فکر مند تھا۔ کچھ سوچ کر نئے گلاس تیار کر کے بولا:

''ڈینی کو فون کرتا ہوں۔ اُس نے کہا تھا، کبھی کڑا وقت آن پڑے تو آٹھ دس روز اُس کے ہاں مہمان بن کر رہ لینا۔ مگر کوئی گرل فرینڈ تم سے ملنے وہاں نہیں آئے گی۔ ورنہ لالی تم دونوں کو اُٹھا کر فلیٹ سے باہر پھینک دے گی۔''

میں نے موبائیل نکال کر اُس کا نمبر ملایا۔ وہ مارننگ سٹار کی میز پر کوئی نئی اسٹوری کمپوز کر رہا تھا۔ چتری میری واحد گرل فرینڈ نہیں تھی۔ دو بھرپور حسین لڑکیاں اور بھی میری زندگی میں شامل تھیں۔ جن کے ساتھ میرے تعلقات بہ یک وقت چل رہے تھے۔ ایک کے ساتھ جنسی اور دوسری کے ساتھ نیم جنسی۔ یعنی وہ لڑکی مجھ کو Oral Sex سے آگے بڑھنے کا موقع کبھی نہ دیا کرتی تھی۔ چتری کو اِن حقائق کا پورا پورا علم تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ میرے ساتھ جب بستر میں داخل ہوتی تو مجھ کو کونڈم (Condom) استعمال کرنے پر مجبور کرتی۔ وہ ایس ٹی ڈی (Sexually Transmitted Disease) کا شکار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ میں احتجاج کرتا کہ میں بالکل صاف ہوں۔ ذمہ لیتا ہوں کہ اُسے کوئی مرض لاحق نہ ہوگا۔ لیکن وہ دور اندیشی جتا کر دوسرا رُخ اختیار کر لیتی۔ ''ہم دونوں بھلے لوگ ہیں۔ ہماری بھلائی اِسی میں ہے کہ ہم احتیاط برتیں۔ ورنہ بچے کی پرورش کون کرے گا؟ تم یا میں؟ جواب دو؟''

میں لاجواب ہو کر رہ جاتا۔ اس لیے کہ روزِ اول سے میں بھی ون پیرنٹ فیملی کے حق میں کبھی

نہ رہا تھا۔ مرد یا عورت کو بہت سی پریشانیوں اور مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

میری زندگی میں بہت سی لڑکیاں آئی تھیں۔ ہر رنگ کی، ہر ذات کی اور ہر مذہب کی۔ لیکن مونا سنگھ چوہان سب سے الگ تھلگ اور نیاری تھی۔ حسن کے معاملے میں فرشتے بھی جھک کر اُسے سلام کریں۔ بدن کی کشش کچھ ایسی تھی کہ ہر ذی ہوش کی رال ٹپکنے لگے۔ اُس سے میرا ایمان جڑ پکڑ لیتا تھا کہ عورت کا خوبصورت جسم دیکھ کر زندگی کا اعتبار بڑھ جاتا ہے۔ لیکن جب میں مونا کو بوس و کنار، ہاتھوں کی گرمائش اور آزمودہ پینتروں سے اُبھار کر اُس سطح پر لے آتا، جب ہمارا روم روم جاگ اُٹھتا اور میں اُس کے بدن کی گہرائیوں میں اُترنا چاہتا تو وہ میرا ہاتھ جھٹک ڈالتی اور کپڑوں کو جھاڑ کر ہنسنا شروع کر دیتی۔ اُس کا بدن میرے لیے معمہ ہی بنا رہتا۔ کئی بار میں محسوس کرتا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہی ہے؟ کئی بار اُس کی خود اعتمادی اور قوتِ ارادی پر رشک بھی آتا کہ میں دریائے تھیمز کے کنارے کھڑا پیاسا ہی رہا۔ لیکن میں بھی ذات کا کھتری تھا، معاف کر سکتا تھا، لیکن بھلا نہیں سکتا تھا۔ میں اُس کا انگ انگ دیکھنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ بس صحیح موقع کا انتظار تھا۔ پھر اُس کے شدید اصرار پر میں نے اُس کا فلم یونین کا کارڈ ہزار مشکلات کے باوجود بنوا دیا تھا۔ وہ بے انتہا خوش ہوئی تھی اور اُسی طرح فلم پروڈیسر اور کاسٹ ڈائریکٹر بھی۔ لیکن مونا کو یہ علم نہ تھا کہ جیون کے Tracks بدلنے پر آدمی کو بعض دفعہ حاصل کم، کھونا زیادہ پڑتا ہے اور بعض دفعہ اِس کے برعکس بھی ہوا کرتا ہے۔ مونا کے ساتھ بھی ایسا ہوا تھا۔ ڈائریکٹروں نے اُس کا اسکرین ٹیسٹ بھی لیا اور وہ اُس کی دبی ہوئی اداکارانہ صلاحیتوں سے مطمئن بھی تھے۔ لیکن اُن کے کچھ اپنے بھی تقاضے ہوا کرتے تھے، جن پر مونا پوری نہیں اُترتی تھی۔ وہ اُن کی صحبت میں ہونٹوں سے بات ضرور کرتی تھی، لیکن پورے بدن سے بات کرنے کا وقت جب آتا تو وہ فُٹ اور ہینڈ بریکیں لگا کر الگ ہو جاتی۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ پروڈیوسر، ڈائریکٹر کی فہرست سے اُس کا نام کٹ جاتا۔ اِن باتوں کا ذکر اُس نے مجھ سے کئی بار کیا تھا۔ میرا جواب بڑا سیدھا سادا ہوا کرتا کہ جیون میں کچھ پانے کو، کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ پھر اِس سوسائٹی میں اِتنے سادھن اور طریقے موجود ہیں کہ بدن کورتی بھر بھی فرق نہ پڑے اور آدمی سیڑھی بہ سیڑھی طے کرتا اپنے مقام پر پہونچ جائے۔

لیکن میری دلائل کا اُس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ بلکہ وہ جھنجھلا اُٹھتی اور دوٹوک لہجے میں اپنا دل اُگلتی۔

''ہم دُنیا کو اپنی اپنی نظر سے دیکھتے ہیں اور ناپتے بھی ہیں...مگر تمہارے خیالات تم کو مبارک ہوں، میں اپنی Virginity میرج سے پہلے گنوانا نہیں چاہتی۔''

اور وہ مجھ کو کچھ ایسے للچائے انداز سے دیکھتی، گویا وہ مجھ کو سنجیدگی سے جتانا چاہ رہی ہو کہ اگر وہ اپنی آبرو کو بچا کر رکھنا چاہتی ہے تو وہ صرف تمہارے واسطے ہے۔

میں تم کو الگ نظر سے دیکھتی ہوں.... میں نہیں چاہتی کہ اپنی Virginity گنوا کر تمہاری لائف پارٹنر بنوں۔''

میرا دل مسرت سے جھوم اٹھتا کہ شکار میرے دام میں ہے، جب چاہوں گا، اُس کو رام کرلوں گا۔لیکن میں اُس سے بیاہ شادی کرنے کے حق میں شروع سے نہ تھا۔حالانکہ وہ سراپا حسن تھی، A Real Bloody Chic۔

میرے اندر کے چالاک آدمی نے ایک بار پھر ہوشیاری دکھائی اور اُسے اپنے فلیٹ پر آنے کی دعوت دے ڈالی۔ اِس بنا پر کہ شادی بیاہ کے معاملے کھڑے کھڑے طے نہیں ہوا کرتے۔ آمنے سامنے بیٹھ کر، پیار محبت کی باتوں کے بعد ہی طے ہوا کرتے ہیں۔اور وہ اگلے روز مقررہ وقت پر میرے فلیٹ میں موجود تھی اور میں خود کوڈان جان سے کم تصور نہ کرتا تھا۔پھر جب ہم نے تبادلہ خیال کر کے سبھی معاشی، معاشرتی، جائیداد، اولاد اور مستقبل کے معاملات طے کر لیے تو ہم نے ہونٹوں اور ہاتھوں کا استعمال کثرت سے کیا۔ پھر ہم نے ایک دوسرے کے بدن سے مکمل واقفیت پیدا کرنا چاہی۔لیکن وہ ایک شیرنی کی طرح بپھر اُٹھی اور چھلانگ لگا کر کھڑی ہوگئی۔ خونخوار نظروں سے یوں تکنے لگی کہ اگر اُس پل اُس کے ہاتھ میں کوئی اسلحہ وغیرہ ہوتا تو وہ مجھے کھڑے کھڑے بھون ڈالتی ۔لیکن میں تو ہر حال میں اُس کا بولتا بدن دیکھنے کو مرا جا رہا تھا۔

''میں تم سے ہزار بار کہہ چکی ہوں۔ میں ابھی اِس کام کے لیے تیار نہیں ہوں۔تم سمجھتے کیوں نہیں؟'' ''مگر تم ڈرتی کیوں ہو ستی ساوتری۔'' میں نے جیب سے پیکٹ نکال کر اُس کی طرف پھینکا۔''میں اِس کا جو استعمال کروں گا۔نہ کوئی ڈر اور نہ کوئی خطرہ، ہم دونوں اپنی اپنی جگہ

خوش... مگر تم تو گھر سے چیسٹیٹی بیلٹ (Chastity Belt) باندھ کر نکلتی ہو؟''

لیکن میرے کہے کا اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ویسی ہی غصے میں اُکھڑی اُکھڑی دکھائی دی۔'' تم مردوں کی دُنیا کے بندے ہو۔ عورت کیا ہے اور اُس کی مجبوریاں کیا ہیں؟ تم کیا جانو؟'' لیکن میں اُس کی باتوں سے کہاں رُکنے والا تھا۔ میں نے اُس کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ وہ میرے ارادوں کو بھانپ گئی۔ اگلے ہی پل ایک اُڑتی ہوئی کرسی مجھے اپنی طرف آتی دکھلائی دی۔ میں نے سر جھکا کر خود کو بچالیا۔ کُرسی کھڑکی کی فریم سے جاٹکرائی۔ کانچ بچ گیا، لیکن فریم پر ضرب آئی اور وہ اپنا نشان چھوڑ گئی۔ میں مارے غصے کے پاگل سا ہو گیا اور اِس سے پہلے کہ میں اُس کو دو چار تھپڑ رسید کر کے گھر سے نکال باہر کرتا۔ وہ اونچے لہجے میں بول اُٹھی: ''تم عورت کو بہت کمزور سمجھتے ہو۔ پر اب ایسا نہیں ہے۔ وہ اپنی دیکھ بھال خود کر سکتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف تیزی سے بڑھی۔ پھر اُسی انداز میں پلٹی اور گویا ہوئی: ''اب تبھی فون کرنا، جب پکا ارادہ ہو کہ میرج سے پہلے میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرو گے؟'' میں اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ اے بیوقوف عورت، تمہاری اِس جارحانہ حرکت کے بعد میں تم سے کیسے شادی کر سکتا ہوں؟ یوں بھی میں اُس لڑکی سے شادی کروں گا جس کے بدن میں حرارت ہو، آگ ہو، تپش ہو اور شعلے ہوں۔ تم جیسی فریجڈ (Frigid) عورت سے میرا نباہ تو ایک دن بھی ہونے سے رہا۔ لیکن یہ سب کہنے کی بجائے میں نے اپنی آواز کی بلندی پر اُسے ''گیٹ آؤٹ'' کہا۔

مگر جانے سے پہلے اُس کے لبوں پر فخریہ مسکراہٹ تھی اور مجھے اِس ڈھنگ سے دیکھ رہی تھی کہ اُس نے پوری کائنات کو فتح کر لیا ہو۔ جاتے جاتے بول اُٹھی:

''میں تم کو پسند کرتی ہوں۔ تم سے میرج کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن تم Sex Maniac ہو۔ بیمار ہو۔ اپنا علاج کراؤ۔''

اُس کے جاتے ہی شکستگی کا احساس میرے ہاں اِتنی گہرائی سے پنپ آیا تھا کہ میں انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ تین روز تک میں چتری اور سمنتھا سے بھی نہ ملا تھا۔ دو روز تک میں نے کھڑکیوں سے پردے بھی نہ ہٹائے تھے۔ نیم اندھیرے میں ہی اپنی قیام گاہ میں بے آسرا پڑا رہا تھا۔ موبائیل کے

ساتھ میرا لینڈ لائن فون بھی سینکڑوں مرتبہ بجا۔ لیکن میں نے ریسیور نہ اُٹھایا۔ احساسِ شکست نے میری 'جون' ہی بدل ڈالی تھی اور میں آتم ہتیا کرنے کی سوچ رہا تھا۔ چوتھے روز میرے دروازے پر دستک ہوئی اور وہ گہری ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ کوئی دروازہ پیٹے جارہا تھا اور اُسے توڑنے کی دھمکی بھی دیے جارہا تھا۔ آواز نسوانی تھی۔

''دروازہ کھولو، میں جانتی ہوں، تم اندر ہو۔ کھولو، نہیں تو میں پولیس کو فون کرتی ہوں۔''

آواز چتری کی تھی۔ میں نے اُٹھ کر بتی جلانا چاہی۔ مگر من نے ساتھ نہ دیا۔ آہستہ سے دروازے کا لیچ (Latch) کھول دیا۔ داخل ہوتے ہی چتری نے مجھ پر ہزار گالیاں نچھاور کیں۔ پھر آگے بڑھ کر بتی روشن کی۔ میری بڑھی ہوئی داڑھی، بھیانک چہرہ اور اُلٹا سیدھا لباس دیکھ کر چیخ اُٹھی، ''تمہاری حالت اِس سے بھی بدتر ہوگی، اگر تم دوسری عورتوں کی سنگت میں رہو گے؟''

اب میں اُسے کیا جواب دیتا کہ پہلی بار مجھ کو کسی عورت کے ہاتھوں شکستِ فاش ہوئی ہے اور میں کہیں کا نہیں رہا۔

''کتنے دن ہوگئے کھانا کھائے ہوئے؟''

میرے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ کھیل گئی کہ میں کھانا تو دونوں وقت برابر کھا رہا تھا۔ اُس کے بنا ایک وقت بھی کاٹنا میرے واسطے محال تھا۔ میں نے دبے دبے لہجے میں کہا:

''اب تم آ گئی ہو تو کھانا مل ہی جائے گا۔''

لیکن اُس نے کچن میں کُگر پر رکھے ساس پین دیکھ لیے تھے۔ بولی:

''پھر ایسا مت کرنا، ورنہ تمہارے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے چیل کوؤں کے آگے ڈال دوگی۔'' میں سب کچھ فراموش کرکے اُس سے بے اختیار لپٹ گیا۔ اور اپنا سر اُس کے سینے پر رکھ کر رونے لگا۔ اُس نے مجھ کو چپ کرانے کی ہر ممکن کوشش کی، بالکل اُس ماں کی طرح جس کا بالک بھٹک کر واپس لوٹے اور لپٹ کر اشکوں کے دریا بہاتا چلا جائے۔

''کیا ہوا تھا؟''

میں سوچ میں ڈوب گیا کہ چتری کو سارا قصہ من وعن بیان کروں یا نہیں؟ لیکن وہ میرے اور

مونا کے تعلقات کا علم رکھتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ مونا مجھ کو فاصلے پر رکھتی ہے۔ میں سر جھکا کر بس اتنا ہی کہہ پایا۔ ''مونا آئی تھی۔''

اُس کا نام فضا میں اُبھرتے ہی چتری کے چہرے پر تشویش کا شائبہ تک نہ رہا۔ وہ منٹوں میں پورے قصے کی تہہ تک پہونچ چکی تھی۔ خوشی خوشی بول اُٹھی:

''چلو اچھا ہوا یہ قصہ تمام ہوا.... تمہارا یوں بھی اُس سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ حالانکہ وہ تمہاری ذات برادری کی ہے۔ تمہاری زبان بھی تم سے بہتر بولتی ہے ... مگر وہ ورجن (Virgin) رہ کر ہی شادی کرنا چاہتی ہے۔''

میں چونکا اور وہ بھی اِس حد تک کہ چتری مجھ کو خبر رساں گماشتہ لگی یا ایک ایسی عورت، جو اپنے شناساؤں کے پس منظر سے خوب خوب واقف ہو۔ مونا نے چند ماہ تک بلڈنگ سوسائٹی میں، چتری کی زیر نگرانی تربیت پائی تھی اور اُس کو وہاں مستقل ملازمت کا پروانہ بھی مل گیا تھا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ ایک دوپہر کو جب مجھے چتری سے نہایت ضروری کام تھا، میں لنچ ٹائم میں اُسے بلڈنگ سوسائٹی میں ملا تھا۔ پب جاتے ہوئے چتری نے مونا کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ میں قدرت کا جیتا جاگتا حسن دیکھ کر واقعی دنگ رہ گیا تھا۔ میں ان دونوں غیر شادی شدہ عورتوں کو دیکھتا من ہی من میں موازانہ کیے جارہا تھا۔ چتری چلے ہوئے کارتوس سے کم نہ تھی، جبکہ مونا بے داغ، کھلا ہوا تازہ گلاب۔ اور جب میں اپنی چالاکی اور ریاکاری سے مونا کو دوبارہ اکیلے میں ملا تو چھوٹتے ہی بولا: ''تم کب تک بلڈنگ سوسائٹی میں سڑتی رہوگی؟ باہر نکلو، فلم میں کام کرو۔ کامیابی تمہارے پاؤں چومے گی۔ تم حسین چہرہ، کافر بدن، سلجھی ہوئی زبان اور صحیح انگریزی لب ولہجہ رکھتی ہو..... برٹش فلم انڈسٹری تمہارا انتظار کر رہی ہے۔''

''ایملی بتا رہی تھی، تم فلم اسٹار ہو۔ کئی ٹیلی سیریل میں کام کر چکے ہو۔ میں نے ایک بار تم کو ''ایسٹ اینڈرز' میں دیکھا بھی تھا؟''

میں نے اپنی جیکٹ کا بایاں کالر کھڑا کر ڈالا اور اس کا ملائم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: ''تم بھی وہاں تک پہونچ سکتی ہو... تمہارے آگے پیچھے تو ہیلی کاپٹر اُڑا کریں... اگر تم نے میرے

تجربے کا فائدہ اُٹھایا تو؟''

''تم مذاق کر رہے ہو؟''

''نہیں۔ جو بدن تم نے پایا ہے، اُس کے آگے کِڈنکول، جولیا رابرٹس، زِٹا جونس اور ہر ایک دم بھی نہیں بھرتیں۔''

چتری نے باتھ روم سے فارغ ہو کر کچن میں رکھے گلاس اُٹھائے اور ان کو میز پر رکھ کر اپنے بیگ میں سے وائن کی بوتل نکالی۔ گلاس بھر کر وہ میرے سامنے ڈٹ کر بیٹھ گئی۔ بولی: مگر بولتے وقت ہنس بھی رہی تھی۔

''مونا کی ٹریجڈی اپنی نہیں، یہ اُس کی ماں کی ہے...اور اِس کارن وہ ویسٹرن پروڈکٹ ہو کر بھی ورجن رہ کر شادی کرنا چاہتی ہے۔''

چتری کا انکشاف میرے لیے تعجب خیز تھا۔ میں اُس کی صاف گوئی کا قائل ضرور ہوا تھا۔ لیکن سوالیہ نظروں سے اُس کی سائیکی میں اُترتا جا رہا تھا۔

''مونا کی شخصیت میں دیواریں اِس کارن اُٹھ آئی ہیں کہ اُس کی ماں جب بیاہی گئی تھی تو وہ ورجن نہیں تھی....اور جب اُس کے شوہر کو علم ہوا کہ اُس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے تو نوبت طلاق تک پہونچ گئی۔ مگر اُس وقت مونا ماں کے پیٹ میں تھی۔''

سارا قصہ سُن کر مجھ کو مونا سے ہمدردی ضرور ہوگئی تھی، لیکن جس انداز سے اُس نے کُرسی مجھ پر اُچھالی تھی، وہ بھلائے نہ بھولتی تھی۔ میرے نزدیک وہ ایک مرد کو ذلیل کرنے کا شرمناک فعل تھا۔ ''میں جانتی تھی، وہ خود کو تمہیں کبھی سُپرد نہیں کرے گی....اور میں خوش ہوں کہ میدان اب خالی ہوا جا رہا ہے۔''

''اور سمنتھا؟''

''وہ دنوں میں تم سے الگ ہو جائے گی۔ تمہاری جیب جو خالی ہے۔ اِن دنوں تمہارے پاس فلم اور ٹیلی کا کام بھی تو نہیں ہے۔ رومانس فرینڈز کے سہارے نہیں چلا کرتے؟''

''یوں بھی وہ مجھ سے میرج کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ تعلقات بڑھتے ہی اُس نے

صاف صاف کہہ دیا تھا۔"

چتری نے اپنا بیگ کھول کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ سُلگا کر بولی:

"یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ زیادہ تر سفید لڑکیاں اب رنگدار لوگوں سے شادی کرنا پسند نہیں کرتیں۔ وہ ملے جلے رنگ کے بچے پیدا کرنے سے ڈرتی ہیں۔"

"ایک وجہ تو یہ ہے ہی۔ دوسری وجہ بھی کم سنجیدہ نہیں۔ سفید عورت خود کو رنگدار شخص سے برتر سمجھتی ہے۔ اُس کا بس چلے تو وہ رنگدار شخص کو غلام بنا کر اپنے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور کرے... جانتی ہو ایک دفعہ اُس نے مجھ سے کیا کہا تھا؟"

"کیا؟"

سمنتھا کے وہ بول یاد کر کے میرے منہ کا ذائقہ بدل گیا تھا۔ گلاس اُٹھا کر میں نے بڑے بڑے گھونٹ بھرے اور قدرے ناپسندیدگی سے بولا:

"ایک بار Love making کے دوران اُس نے پوری طاقت سے مجھ کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ بولی، تمہارا مضبوط بدن، مردانہ قوت اور LIBIDO سے میں اِتنی خوش ہوں کہ دل چاہتا ہے تم کو اپنے پاس ہی رکھ لوں۔ صبح کام پہ جاتے ہوئے تمہارے پاؤں میں زنجیر ڈال دیا کروں اور واپسی پر کھول دیا کروں۔"

"پھر بھی تم اُس سے ملا کرتے ہو؟"

"کیا کروں، مجبور ہوں۔ کیا بدن پایا ہے اُس نے۔ ہر پل باتیں کرتا ہوا، دوری کی، نزدیکی کی، خود میں کھو جانے کی۔ اُس وقت میں زندگی سے زیادہ محبت کرنے لگتا ہوں۔"

تین روز سے شراب کا ایک قطرہ بھی میرے اندر نہ گیا تھا۔ چتری نے کچن سے گلاس لا کر جب میز پر رکھے تھے اور بوتل کھول کر گلاس بھرے تھے تو میں اپنی شکست اور مونا کو وقتی طور پر بھول گیا تھا۔ حالانکہ اُس عورت نے تین روز تک میرا اندرون، بیرون اور سکون برباد کر ڈالا تھا۔ کئی بار میں نے دوسری منزل سے چھلانگ لگانے کو بھی سوچا تھا۔

ایک ویک اینڈ پر چتری کے کہنے پر میں اُسی کی رہائش گاہ پر شام کے وقت حاضر ہو گیا۔ اُس

کی سب سے چھوٹی بہن نیشا بھی وہاں موجود تھی۔ بڑی پیاری بچی تھی۔ اُس کو دیکھ کر پیار آتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ یکسر گوری چٹی، بھرا بھرا بدن اور اپنی موجودہ تین برس کی عمر سے کہیں بڑی دکھائی دیتی تھی۔ مگر اُس شام اُس کو وہاں پا کر مجھ کو ذرا بھی خوشی نہ ہوئی تھی۔ اُس کی موجودگی میں شام غارت ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح میری ٹانگوں سے آن لپٹی۔ میں نے اپنی خود غرض خواہش کو بالائے طاق رکھ کر اُسے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اُس نے بھی سدا کی طرح اپنے بازو میرے گلے کے گرد پھیلا دیئے۔ چتری ہمیں اِس حالت میں دیکھ کر بڑی خوش ہوئی۔ خوشگوار لہجے میں بولی:

''نیشا جتنا تم کو پسند کرتی ہے، میرے کسی دوست کو نہیں کرتی؟''

''کاش تم نے بتایا ہوتا کہ نیشا بھی شام میں یہاں ہوگی، تو میں اُس کے لیے کچھ چاکلیٹ اور بسکٹ لے آتا۔''

''میرے گھر پر بہت سے چاکلیٹ پڑے ہیں تم اُس کو اپنے ہاتھوں سے کھلا دینا۔''

چتری نے اُس کے واسطے بہت سے کھلونے بھی خرید رکھے تھے۔ وہ کمرے کے وسط میں بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے نیشا کو خود سے الگ کر کے کھلونوں کی طرف بھیج دیا۔ وہ خوشی خوشی کھلونوں کی دُنیا میں کھو گئی۔

میں اور چتری دیر تک اِدھر اُدھر کی باتوں کے ساتھ اُلٹے سیدھے مذاق بھی کرتے رہے۔ ساتھ میں پینا پلانا بھی جاری رہا۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اور نشہ بھی۔ نیشا تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔ وہ کھلونوں کو چھوڑ کر چتری کی گود میں چلی آئی۔ اُس نے اُٹھ کر کیبنٹ سے کِٹ کیٹ کا چاکلیٹ نکال کر مجھ کو دیا کہ میں نیشا کو کھلا دوں۔ وہ چھلانگ لگا کر میری گود میں آن بیٹھی اور چاکلیٹ میرے ہاتھ سے چھین کر کھانے لگی۔ ہم دونوں ہنس دیئے اور جب نیشا نے چاکلیٹ ختم کیا تو چاکلیٹ سے بھرے ہوئے ننھے ننھے ہاتھ میرے آگے پھیلا دیئے۔ میں اُس کو اُٹھا کر سِنک (Sink) پر لے گیا۔ اُس کے ہاتھ دُھلائے، منہ بھی صاف کیا۔ اگلے پل ہی اُس نے میرا رُخسار چوم لیا اور گلے میں بازو حمائل کر کے اپنی پوری طاقت سے میری گردن بھینچ ڈالی۔ میں جانتا تھا کہ

وہ اکثر مجھ میں فادر فگر کو تلاشتی ہے۔ دراصل چتری کی ماں نے تین چار شادیاں کی تھیں۔ کوئی بھی شوہر اُس کے ساتھ زیادہ دیر نہ رہا تھا۔ اُس کے بچوں کو ٹھیک ٹھیک علم نہ تھا کہ اُن کا اصلی باپ کون ہے؟ اور کون نہیں ہے؟

نیشا منٹوں میں سوگئی تھی۔ چتری نے دیوان صوفہ کھول کر اُس کا بستر بنایا اور اُسے لٹا کر گلے تک کمبل اوڑھا ڈالا۔ پھر اُس کا ماتھا چوما اور میری طرف دیکھے بغیر ڈمر (Dimmer) کی مدد سے کمرے کی روشنی کم کر دی۔

''تم کو نیشا بہت پیاری ہے؟''

''یہ تو میری جان ہے۔''

''لیکن کیا وجہ ہے کہ میں نے آج تک تمہارے گھر پر تمہارے کسی دوسرے بہن بھائی کو نہیں دیکھا؟''

''وہ بڑے رَف (Rough) ہیں۔ میرے کنٹرول میں نہیں رہتے۔'' اُس نے ترنت کہا:

''لیکن نیشا کی بات الگ ہے۔ میں اُس میں خود کو دیکھتی ہوں... جس وِیک اینڈ پر وہ میرے ہاں چلی آتی ہے۔ میری مام اور میرے بہن بھائی اُس کو بہت مِس کرتے ہیں... دیکھا جائے تو یہ ہماری Broken Family کی جان ہے اور میری تو ہے ہی۔''

یہ کہہ کر وہ اُٹھ بیٹھی۔ پلنگ دو ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔ چتری نے نیشا اور ہمارے درمیان پردہ کھینچ دیا۔ روشنی مدھم تھی۔ وہ خود کو بے لباس کیے جا رہی تھی اور اس ڈوبتی روشنی میں اُس کے فربہ بدن پر کہیں پرچھائیاں اُبھر رہی تھیں تو کہیں اندھیرا اچھل رہا تھا۔ اُس کا بدن مجھ کو دُنیا کا حسین ترین بدن محسوس ہوا۔ اُبھرا اُبھرا، قدرے بل کھاتا اور دعوت دیتا ہوا۔ میں اُس کا انگ انگ بھنبھوڑنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس رات اُس نے میرے بائیں ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی تھی اور مجھ کو پلنگ سے باندھ کر قیدی بنا ڈالا تھا۔ کھیل پُرانا تھا۔ اُس کے اپنے اُصول تھے۔ لیکن میرا ذہن چتری کے ماں باپ اور سوتیلے بہن بھائیوں کی طرف مائل تھا۔ میں نے اپنا آزاد ہاتھ بلند کر کے بہ آوازِ بلند کہا:

''چتری کیا وجہ ہے کہ تم نے دو برسوں میں کبھی اپنی ماں یا بہن بھائیوں سے نہیں ملایا؟''

''آہستہ بولو۔ نیشا سو رہی ہے۔''

لیکن میں نے ہتھکڑی کو پلنگ سے بجا کر پھر کہا: ''چتری، تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟''

اُس نے فوراً 'شی' کہہ کر میرے ہونٹوں پہ اُنگلی رکھ دی اور خاموش رہنے کی تلقین کی۔ پھر میرا دوسرا ہاتھ بھی ہتھکڑی میں ڈال کر پلنگ کے دوسرے سرے سے باندھ دیا۔ میں نے کوئی مدافعت نہ کی کہ آج میں اُس کی حراست میں تھا۔ اچانک تیرہ سٹون کا بھاری بھرکم بدن مجھ پر پھیل گیا اور ہم پوری دنیا کو فراموش کیے لاکھوں، کروڑوں باتیں ہونٹوں سے، ہاتھوں سے اور دیگر بدنی اعضا سے کرنے لگے۔ ہم پسینے میں قریب قریب نہا چکے تھے۔ لیکن میرے دل و دماغ سے وہ خیال الگ نہیں ہو پا رہا تھا، جو میری سوچ پر حاوی تھا۔ میں اُسے پوچھنے سے ڈر بھی رہا تھا اور باز بھی نہیں آ رہا تھا۔ جب مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے ہتھکڑیاں جھنجھنا کر اور خود کو بستر پر اُچھال کر کہا:

''چتری۔ اِس پل تم پاک روحوں کے درمیان کھڑی ہو۔ سچ سچ بتاؤ کیا نیشا تمہاری بیٹی ہے؟'' اُس کے میرے جسم پر چلتے ہوئے ہاتھ رُک سے گئے۔ سوچ کر بولی:

''جب تم ایسا محسوس کرتے ہو۔ سمجھتے ہو اور جانتے بھی ہو، تو پھر پوچھتے کیوں ہو؟''

میں نے دونوں طرف کی ہتھکڑیاں اتنے زور سے کھڑکائیں کہ نیشا جاگ اُٹھی اور اُس کے رونے کی آواز سُن کر میرا احتجاج سرد پڑ گیا۔ خود کو میں نے بستر پر پھیلا دیا، کچھ یوں کہ میں سنسار کی چاروں دِشاؤں میں پھیل گیا ہوں۔ چتری اپنی بیٹی کو چپ کرا کر اور اُسے لاڈ پیار کر کے لوٹی تو اُس نے چپکے سے میری ہتھکڑیاں کھول دیں۔ پھر مجھ کو اپنے مضبوط بازوؤں میں بھر لیا، گویا میں بھی نیشا کے بعد اُس کا چھوٹا سا بیٹا ہوں۔ لیکن میرا تجسّس مجھ سے الگ نہیں ہو پا رہا تھا۔ چتری نے کمبل کھینچ کر مجھ پر بھی پھیلا دیا اور سو گئی۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ میں بے سُدھ سو رہا تھا۔ اچانک میں نے اپنے بائیں کان کی لو پہ چتری کی زبان کی رطوبت محسوس کی۔ میری آنکھیں بند تھیں، بند ہی رہیں۔ مگر میرے اندر کی آنکھ وا ہو چکی تھی۔ چتری نے میرا کان چوم کر سرگوشی کی:

''اگر تم نے مجھ کو کسی بھی موڑ پر چھوڑا تو سات چُھریاں تمہارے پیٹ میں گھونپ دوں گی۔''

میرے بدن میں اِتنی گہری جھرجُھری ہوئی کہ لگا برقی لہر میرے بدن کو چھو گئی ہے اور میں صرف تڑپ ہی نہیں، سہم بھی گیا ہوں۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور پھیلی پھیلی آنکھوں سے چتری کو دیکھنے لگا۔

''ڈر گئے نا؟ گھبراؤ مت... میں سات چُھریوں سے تم کو گھائل نہیں کروں گی... ایک ہی چُھری سے ہلاک کروں گی۔ منظور ہے؟''

مجھ کو رات کے گہرے اندھیرے میں چتری سے خوف آنے لگا تھا۔ وہ طاقتور عورت تھی اور عزم کی پکی۔ لیکن میرا دماغ کہیں مجھ سے یہ بھی کہہ رہا تھا کہ وہ مذاق کر رہی ہے۔ لیکن اُس کا مذاق واقعی بھیانک تھا اور جان لیوا بھی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ ہر مذاق کے پیچھے کہیں نہ کہیں سچ بھی چھپا ہوتا ہے۔ میرے چہرے کا رنگ قدرے بدلا تو اُس نے میرا سر اپنی چھاتیوں میں چھپا لیا اور میری پیٹھ کو سہلا کر، مجھے ایک خوفزدہ بچہ سمجھ کر پیار کرنے لگی۔

''رات، جس نوٹ پر ہم نے گفتگو چھوڑی تھی۔ اب میں اُس کو آگے بڑھاتی ہوں۔''

میں اپنے حواس دُرست کر کے اُس سے الگ ہو گیا اور آلتی پالتی مار کر اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''تم کیا جانو، اِس دُنیا میں مرد کتنا بڑا جانور ہے۔ وہ جنگلی جانوروں سے بھی کئی ہاتھ آگے نکل چکا ہے۔'' پیغام مجھ تک پہونچ گیا تھا کہ وہ بہت جلد اپنا دردناک تجربہ بیان کرنے والی ہے کہ اُس کی بیٹی نیشا کا باپ کون ہے؟ اور یہ سارا سلسلہ کیونکر وجود میں آیا تھا؟ میرے ہونٹ سِل چکے تھے۔ لیکن میرے ہاتھ دھیرے دھیرے اُس کے بالوں کے ساتھ، اُس کے بدن کو بھی چھو رہے تھے اور وہ خوش تھی۔ مگر جب اُس نے بولنا شروع کیا تو اُس کی خوشی سنجیدگی میں بدلتی چلی گئی۔ وہ کبھی چھت کو دیکھتی اور کبھی کھڑکی پہ پڑے ہوئے پردے کو۔

''کیا بتاؤں۔ کیا ہوا، کیا نہیں ہوا اور کیسے ہوا... اُن دنوں میں کنگسٹن یونیورسٹی میں تھی۔ دوسرا سال تھا اور میرا اسبجیکٹ اکاؤنٹنسی تھا۔ ہم کلیپم جنکشن کے قریب کونسل فلیٹ میں رہتے تھے... تم جانتے ہی ہو، میری ماں نے تین شادیاں کی تھیں۔ اِس کے علاوہ بھی اُس کے چند لوگوں کے

ساتھ تعلقات رہے تھے۔ مگر وہ کبھی مطمئن نہ ہو پائی تھی۔ اُس کا کہنا تھا کہ اُسے کبھی ڈھنگ کا آدمی نہیں ملا، جس نے اُس کی قدر کی ہو۔"

میں اُس کے خانوادے کے متعلق بس اتنا ہی جانتا تھا۔ مگر اب وہ تمام سرحدوں کو پار کر کے آخری منزل تک پہونچنا چاہتی تھی اور مجھ جیسے شخص کو گذشتہ دو برسوں سے انتظار تھا۔

"میرے ڈیڈ نے میری مام سے الگ ہونے پر اپنی انگلش برادری میں شادی کر لی تھی.... مگر وہ میری پرورش کے واسطے کورٹ کی مقررہ رقم برابر دیتا رہا۔ وہ ہر دوسرے ہفتے مجھے گھمانے پھرانے بھی لے جاتا تھا۔ میں اپنے ڈیڈ کو بہت چاہتی تھی، اُس کو مس بھی بہت کرتی تھی۔ اُس کی کمی میرے سوتیلے باپوں نے پوری کرنا چاہی تھی۔ لیکن میں اُن کے نزدیک جاتے ہوئے گھبراتی تھی۔ اُن کی صورت میں مجھ کو منہ کھولے جانور دکھائی دیتے تھے، اپنی اپنی زبان ہلاتے ہوئے۔"

"چتری۔" میرے ہونٹ شعوری کوشش کے بغیر ہی کھل گئے۔ "پلیز، میں صرف ایک بات میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ نیشا کا باپ کون ہے؟ اور وہ کہاں ہے؟"

میری آواز کا تحکم اُس کو بہت پسند آیا تھا۔ اُس نے میرا گال چوم لیا اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی رہی۔ "ویک اینڈ تھا۔ میں گھر پر تھی۔ مام میرے دو بہن بھائیوں کے ساتھ شاپنگ کو گئی تھی۔ باقی بہن بھائی دوستوں کے ساتھ باہر تھے۔ میں اسٹڈی کر رہی تھی۔ ایگزیم (Exam) سر پر تھے۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میرا ڈیڈ وہاں کھڑا تھا۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا تھا سدا کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ مام کو میرے انشورنس پیپرز دینے آیا تھا جو میری اکیسویں سالگرہ پر کیش کیے جانے والے تھے۔ میں نے ڈیڈ سے چائے کے لیے پوچھا۔ گھر میں مجھ کو اکیلا پا کر اُس کے چہرے کا رنگ بدل سا گیا۔ جانے کیوں؟ اُس نے وہ کاغذات میرے حوالے کر کے جانا چاہا۔ اور چلتے وقت اُس نے میرا گال چوما اور ویسا ہی پیار کیا، جیسا کہ وہ کیا کرتا تھا۔ مگر پھر اُس کے ہاتھوں کی حرکتیں اور انداز بدل سے گئے... میں نے احتجاج کر کے اُس کی بانہوں سے آزاد ہو کر شور مچانا چاہا۔ لیکن اُس نے اتنے زور کا چانٹا رسید کیا کہ میں غش کھا کر گر گئی۔ وہ ہانپتے کانپتے اور لمبے لمبے سانس بھرتا مجھ پر سوار ہو گیا... اور جب مجھے ہوش آیا تو وہ جا چکا تھا۔

دروازہ کھلا تھا۔ میری مام میرے نزدیک کھڑی چیخ رہی تھی۔ سارا گھر اُس نے سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اور میں اپنی پوری دنیا کو لٹائے چھت کو ساکت نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔''

اُسے خاموش پا کر میں بھی خاموش ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور میرے ہاں اُس کے لیے اتنی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی کہ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کیا دنیا میں ایسا بھی ہوا کرتا ہے؟ پھر خیال آیا کہ چتری نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ مرد جنگلی جانوروں سے بھی کئی ہاتھ آگے نکل چکے ہیں۔ ہم چپکے سے لیٹ گئے اور دیر تک اُسی حالت میں بے حس و حرکت پڑے رہے۔ ''بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ میری مام ہاتھ میں چمڑے کی موٹی سی پیٹی تھامے میرے ڈیڈ کے گھر پر پہونچ گئی۔ اُس نے میرے ڈیڈ سے کچھ پوچھے بغیر اُس کی دُھنائی اِتنی بے دردی سے کی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ اُس کی بیوی نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اُس کی چیخ پکار سن کر دروازے پر اڑوس پڑوس کے لوگ آن جمع ہوئے۔ لیکن مام کی پیٹی اُسی انداز سے چلتی رہی، بلکہ ستاروں سے مزین پیٹی مزید زور پکڑ بیٹھی تھی۔ اُس کے نزدیک آنے کو کوئی بھی تیار نہ تھا اور وہ ڈیڈ کو پیٹتے ہوئے چلا چلا کر کہے جا رہی تھی کہ اگر وہ صحیح مرد ہے تو پولیس کو بلائے۔ مگر ڈیڈ تو ہر وار پہ معافی مانگ رہا تھا۔ وہ رو دھو رہا تھا۔ آخر مام نے چلتے وقت دروازے پر کھڑے ہجوم کو چیر کر ڈیڈ سے کہا، ''اب تم میرے مکان پر کبھی نہیں آؤ گے۔ اور اپنی بیٹی کی شکل مرتے دم تک نہیں دیکھ پاؤ گے۔ سمجھے You Animal۔''

ہم دیر تک خاموش رہے۔ چتری کی آنکھوں سے اشک جاری تھے۔ میں نے چادر کے کونے سے اُس کے آنسو صاف کیے اور آنکھوں کو چوم کر کہا، ''تو نیشا تمہاری بیٹی بھی ہے اور تمہاری بہن بھی؟''

سوال اتنا کاٹ دار تھا کہ وہ اُس کی شدت کو برداشت نہ کر پائی تھی۔ یکبارگی اُس نے اپنا منہ میرے سینے میں چھپا لیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔ ہم دیر تک اُس حالت میں خاموش آنکھوں سے باتیں کرتے رہے۔

پو پھٹ رہی تھی۔ کھڑکی پر پڑے پردے کا رنگ بدل رہا تھا۔ لیکن ہم میں کوئی تبدیلی نہ آئی

تھی۔ ہم بستر پر دراز اپنی اپنی سوچ میں دیر سے گم تھے۔ انجام کار میں نے زیرِ لب کہا: ''نیشا کو فادر فِگر کی ضرورت ہے۔ بہت پیاری بچی ہے۔''

چتری نے میری گردن پر اپنے دانتوں کے نشان اتنے گہرے چھوڑے کہ بے ساختہ میری چیخ نکل گئی اور میں تڑپ اٹھا۔ لیکن جب مجھے اُس کے دانتوں سے رہائی ملی تو میں نے اپنی گردن کو چھو کر جاننا چاہا کہ نقصان کس حد تک ہوا ہے؟ لیکن اُس نقصان کا اپنا ہی نشہ تھا، اپنا ہی مزا تھا۔ چتری مزید میرے دل کے قریب آ چکی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ عمر بھر اسی طرح مجھ کو کاٹتی رہے، بھنبھوڑتی رہے اور اُس کے جذبات کبھی سرد نہ ہوں۔

''بعد میں کبھی تمہارا ڈیڈ تم سے ملا؟''

''نہیں۔'' اُس کی آواز میں تلخی تھی اور نفرت بھی: ''سننے میں آیا تھا، اُس کی بیوی نے ڈیڈ کو گھر سے نکال دیا تھا۔''

''کیوں؟''

''اُن کی بیٹیاں جوان ہو رہی تھیں۔''

''پھر؟''

''پھر کیا... یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ وہ لندن چھوڑ کر کینٹر بری چلا گیا ہے۔ وہ دن بھر وہاں کے بڑے گرجا گھر کے باہر کھڑا موم بتیاں بیچا کرتا ہے اور گردن جھکائے کسی سے بات نہیں کرتا۔''

میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور دیر تک چُپ رہا۔ چتری کی آواز نور کے تڑکے میں دھیرے سے اُبھری: ''نیشا تم کو بہت پسند کرتی ہے؟''

''جانتا ہوں۔ وہ مجھ میں اپنا باپ تلاش کرتی ہے... چتری، ہم نیشا کو اپنے پاس ہی رکھ لیں گے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟''

چتری کا جواب اُس کے دانتوں کے ذریعے مجھ تک پہونچ گیا تھا۔ اُس نے میرا انگ انگ پیار سے کاٹ ڈالا تھا۔ میٹھا میٹھا درد میرے بدن میں رینگ رہا تھا۔ لیکن میں خوش تھا کہ وہ درد ہی میری روحانی غذا تھی۔

ڈینی بارسوخ شخص تھا۔ اُس کے اثر ورسوخ کا یہ عالم تھا کہ وہ سوسائٹی کے ہر شعبے میں کسی نہ کسی چھوٹی بڑی شخصیت سے واقفیت ضرور رکھتا تھا۔ آدمی ملنسار تھا اور صاف گو بھی۔ لہذا واقف کار بنانے میں اُسے کوئی دشواری نہ ہوا کرتی تھی۔ لیکن دوست اُس کے تین چار ہی تھے، جن میں سے ایک میں بھی تھا۔ وہ میرے پیغمبری دور کے ہر اُونچ نیچ کی خبر رکھتا تھا۔ ایک شام کھانے کے دوران اُس نے مجھ سے کہا کہ میں اگلی صبح فلم ایجنٹ جان لینن سے جا کر مل لوں۔ اُس کا نام سن کر میں کرسی سے اُچھل پڑا۔ وہ شخص انتہائی تجربے کار اور مشاق ایجنٹ تھا۔ اُونچی سطح کے فلمی اداکار اُس کے موکل تھے۔ چھوٹے موٹے اداکار کو وہ دور سے بھی دیکھنا پسند نہ کرتا تھا۔ پھر میں تو ایشیائی اداکار تھا۔ میری گاڑی بھی پٹری سے اُتر چکی تھی۔ کوئی ایجنٹ یا پروڈیوسر ڈائریکٹر مجھے کام دینے میں زیادہ دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ میں نے یہ تمام حقائق ڈینی سے بیان کیے تو وہ غصے سے دیوانہ ہوگیا۔

''تم عجب آدمی ہو۔ میں تمہارے واسطے اِدھر اُدھر فون کرتا پھرتا ہوں۔ اور تم ہمت ہارے بیٹھے ہو۔ بہانے تلاش کرتے پھرتے ہو۔''

''نہیں ڈینی، ایسا نہیں ہے۔ جان لینن اِس کنٹری کا ٹاپ موسٹ ایجنٹ ہے۔ وہ مجھ سے ضرور ملے گا۔ میرے فلم کیریر کی معلومات بھی ریکارڈ کرے گا۔ لیکن چند باتوں کے بعد مجھ کو چلتا کر دے گا؟''

''اگر جان لینن برٹش فلم انڈسٹری کا ٹاپ ایجنٹ ہے تو میں برٹش پریس کا ٹاپ جرنلسٹ ہوں۔ دیکھتا ہوں وہ تمہاری مدد کیسے نہیں کرتا؟''

اور اگلے روز وقتِ مقررہ پر میں جان لینن کے دفتر میں موجود تھا۔ دفتر عالیشان تھا۔ دیواروں پر کئی سابق اور موجودہ فلمی ستاروں کی تصویریں لگی تھیں۔ جان لینن کے سفید بالوں کو دیکھ کر خیال آیا کہ وہ یقیناً فلم انڈسٹری کے نشیب وفراز میں ہی پکے ہوں گے۔ اُس کی جوہر شناس آنکھیں موٹے شیشوں سے جھانک رہی تھیں۔ وہ میرا ڈیل ڈول، بدن، نین نقش، آواز کا اُتار چڑھاؤ اور لب ولہجے سے کافی متاثر ہوا تھا۔ اور جب اُسے یہ علم ہوا کہ میرا بنیادی تعلق انڈیا کے

صوبے پنجاب سے ہے اور میں بامبے کی بالی ووڈ فلموں میں کام بھی کر چکا ہوں تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اُس کی نظریں میرے چہرے سے ہٹ ہی نہیں پا رہی تھیں۔ پھر اُس نے مجھے بتایا کہ بی بی سی کی ایک سیریل میں ایک سکھ نوجوان کا رول ہے۔ وہ وکٹورین اور Pidgin انگلش اپنے پنجابی لہجے میں اِس ادا سے بولتا ہے کہ اُس کی گلابی انگریزی سن کر ہر کوئی محظوظ ہوتا ہے۔ وہ جعلی امیگرانٹ ہے اور چھپ چُھپ کر اور ڈر ڈر کر دن رات گزارتا ہے۔ اُس رول کو پانے کے لیے سات آٹھ ایشیائی اداکار قسمت آزما چکے ہیں۔ لیکن کوئی بھی ڈائریکٹر کی کسوٹی اور اُس کے معیار پر پورا نہیں اُترا۔ تم چاہو تو وہ رول کر سکتے ہو، مگر ٹیسٹ دینا ہوگا؟ میں پس و پیش میں تھا کہ وہ رول قبول کروں یا نہیں؟ اِس لیے کہ مجھ کو سیریل میں ایک سکھ نوجوان کا حلیہ اپنانا تھا۔ سر پر پگڑی اور چہرے پر داڑھی مونچھ۔ ناظرین میں شاید ہی کوئی مجھے پہچان پائے؟ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا جواب دوں؟

دو روز کے بعد اسکرین ٹیسٹ تھا۔ میک اَپ اور گیٹ اَپ کے بعد جب میں نے آئینے میں خود کو غور سے دیکھا تو اپنے سامنے ساؤتھ ہال کے کسی سکھ نوجوان کو بیٹھا ہوا پایا۔ میری اپنی پہچان کہیں گم ہو کر رہ گئی تھی اور مجھے افسوس بھی ہوا تھا۔ لیکن اُسی وقت یہ خیال بھی آیا کہ اِس انوکھے رول سے میں اپنے پانو پھر سے جما سکتا ہوں۔ ٹیسٹ کے دوران میں نے ڈائریکٹر کے سبھی تقاضے بہ ہوش و حواس پورے کیے اور وکٹورین انگلش کے ڈائیلاگ، پنجابی لہجے میں اتنی خوبی سے ادا کیے کہ شاٹ کے ختم ہونے پر ڈائریکٹر نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور مبارکباد دی۔

اُس شام میں نے چتری کے بعد، ڈینی کو خوشی کی خبر سنائی تو وہ مجھ سے زیادہ مجھے خوش خوش لگا۔ اعتماد کے ساتھ جواباً بولا:

''رتن، تم پیدائشی فن کار ہو۔ کوئی بھی رول نبھا سکتے ہو... لو، اب میں بھی تم کو خوشی کی ایک خبر سناتا ہوں۔''

''وہ کیا ہے؟''

''میں اور پا کو شادی کر رہے ہیں۔ فیصلہ ہو گیا ہے۔ اور تم میرے بیسٹ مین بنو گے۔''

''واہ، مزا آ گیا۔ زندہ باد۔''

ٹیلی پر میرا سکھ کردار ایشیائی اور مقامی لوگوں نے خوب پسند کیا تھا۔ ڈائریکٹر سیانا تھا۔ اُس نے میرے کسرتی بدن کا پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ ایک سین میں مجھ کو ڈنڈ بیٹھک نکالتے ہوئے مختلف زاویوں سے دکھایا گیا تھا۔ میرے بدن کی ساخت، پٹھے اور مچھلیاں دیکھ کر ناظرین میری شخصیت زیادہ پسند کرنے لگے تھے۔ دنوں میں ہی میں اِتنا مشہور ہوگیا تھا کہ مجھے کئی دوسری سیریل بھی مل گئیں۔ ہر نیا کنٹریکٹ سائن کرنے پر ہندی زبان کا محاورہ میرے حالات پر صادق آ رہا تھا کہ بھگوان جب کسی کو دیتا ہے تو چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔ میرے حالات اِتنی تیزی سے بدلے کہ مجھے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ کایا پلٹ اِتنی جلد بھی ہوا کرتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں لندن کے ایک امیر ترین علاقے میں ایک شاندار فلیٹ کا مالک تھا اور قیمتی کار ہر دم میرے نیچے رہا کرتی تھی۔ میرا لائف اسٹائل بدل گیا تھا۔ نیا سرکل، نئے لوگ، نئے تعلقات۔ آدھی آدھی رات تک پارٹیاں، پینا پلانا۔ پھر کبھی نائٹ کلب کبھی کیسینو اور کبھی نئے ٹھکانے اور نئے بستر۔ چتری میری کامیابی پر مجھ سے زیادہ خوش تھی۔ لیکن میں اُس کو بہت کم وقت دے پا رہا تھا۔ میں حسین چہروں سے متعارف ہو رہا تھا۔ کسی کے ساتھ ون نائٹ اسٹینڈ ہوا کرتا تھا تو کسی کے ساتھ چند روزہ بناوٹی رومانس۔ پھر معاملہ ختم۔ چتری سب جانتی تھی اور محسوس بھی کرتی تھی۔ مگر براہِ راست شکایت نہ کرتی تھی۔ لیکن مذاق مذاق میں اِتنا ضرور کہا کرتی تھی۔ ''ایک چُھری آدمی کے سینے میں اُتر کر اُسے تڑپا تڑپا کر مارا کرتی ہے۔ سوچ لو۔'' لیکن میں تو کب کا سوچ چکا تھا کہ آگے چل کر مجھ کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا؟ چتری کے لاشعور میں یہ ڈر بھی بیٹھ چکا تھا کہ میں بدل گیا ہوں۔ اُس کی اب زیادہ پرواہ نہیں کرتا اور کسی روز بھی اُسے گڈبائے کہہ کر کنارہ کش ہو جاؤں گا۔ ایک رات ہم ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے ڈِنر کر رہے تھے کہ چتری نے فلسفیانہ انداز میں کنویشش کا مشہور قول میرے کان میں ڈال دیا:

''Woman in dark with a man... often sees light''

(عورت، مرد کے ساتھ اندھیرے میں رہ کر اکثر روشنی دیکھا کرتی ہے)

میں نے قول کا مذاق اُڑا کر دریافت کیا: ''اُس روشنی میں تم کو اور کیا دکھائی دیتا ہے؟''
''بہت کچھ۔'' پھر انتہائی سنجیدہ ہو کر بولی: ''ہسپتال کا ایک وارڈ ہے۔ اُس میں ایچ آئی وی (HIV) اور ایڈز (AIDS) کے مریض زیرِ علاج ہیں... ایک بستر پر بیٹھا مریض گہری فکروں میں ڈوبا ہے۔ اُس کو دیکھ کر تمہارا دھوکہ ہوتا ہے؟''
میں چونک اُٹھا۔ خوف میری ریڑھ کی ہڈی تک سرایت کر گیا۔ برہم ہو کر میں چیخ سا اُٹھا۔
''یوں کہو کہ وہ شخص میں ہوں۔ مگر تم جانتی ہو، میں اب رِسک نہیں لیتا۔ احتیاط برتنے لگا ہوں۔''
''کبھی کبھی سیانا آدمی بھی دھوکہ کھا جاتا ہے... اور پھر آخری سانس تک پچھتاتا ہے۔''
یہ کہہ کر وہ تیزی سے اُٹھی۔ نیپکن میز پر پٹکا اور ریسٹورنٹ سے باہر چلی گئی۔ میں پکارتا ہی رہ گیا۔
پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ رات کو تکیے پر سر رکھ کر، آنکھ بند کرنے سے پہلے سوچ کا دھارا ایک الگ سمت میں بہہ نکلتا۔ چتری کے بول یاد آنے لگتے۔ میں بھی محسوس کرتا کہ میں بہت تھک گیا ہوں، مجھ کو اپنا لائف اسٹائل بدلنا ہوگا؟ ورنہ اپنی صحت خراب کر بیٹھوں گا اور اپنا کیریر بھی۔ کہیں کوئی اُلٹی سیدھی بیماری نہ لے بیٹھوں؟ اور تا دمِ آخر دواؤں اور انجیکشنوں کے سہارے زندہ رہوں۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ جب کوئی نیا پنچھی اُڑ کر میرے قریب آتا تو میں سب کچھ فراموش کیے اُس کے پر کاٹنے پر آمادہ ہو جاتا۔ بعد ازاں نہ تو اُس سے دوبارہ ملتا اور نہ ہی اُس کو پہچانتا۔ لیکن میرا ضمیر مجھ کو کٹہرے میں کھڑا ضرور کر ڈالتا اور میں خود کو گنہگار تسلیم کرتا۔ یہ احساس بھی رفتہ رفتہ جڑ پکڑتا جا رہا تھا کہ بدن کوئی بھی ہو، کیسا بھی ہو اور کسی بھی ذات کا ہو، اگر اُس کی مالکن کے ساتھ ذہنی تال میل نہ ہو تو وصال بے معنی ہے۔ عبث ہے۔
ایک سہانی صبح، مجھے شوٹنگ پر جانا تھا۔ سیریل نئی تھی۔ پہلا شیڈول تھا۔ لوکیشن ٹال ورتھ کارنر میں کوئی ایشین نیوز پیپر شاپ تھی، جس میں مجھ کو شاپ کیپر کا رول ادا کرنا تھا۔ میں باتھ سے نکلا ہی تھا کہ ایک فون آیا۔ آواز نسوانی تھی، مگر غیر مانوس۔ رسمی جملوں کی ادائیگی کے بعد اُس عورت نے بتایا کہ وہ مونا سنگھ چوہان بول رہی ہے۔ ملنا چاہتی ہے۔ انکار مت کرنا۔ ایک طویل

مدت کے بعد اُس کی آواز اور اُس کا نام سننے میں آیا تھا۔ اُس کا حلیہ دماغ میں بیٹھتے ہی وہ شام بھی اُبھر کر میرے سامنے آ گئی، جب اُس نے کرسی اُٹھا کر اچانک میری طرف اُچھال ڈالی تھی۔ لیکن میں بال بال بچ گیا تھا۔ ابھی موجودہ منٹ کا تین چوتھائی حصہ بھی نہ گزرا تھا کہ اُس کا بل کھاتا بدن، گول گول چھاتیاں، بھرے بھرے گال اور پتلے پتلے ہونٹ اُبھر کر میرے سامنے پھیل گئے۔ میں اُن کو کیونکر بھول سکتا تھا کہ میں اُس کے بدن کے دیگر حصے بھی دیکھنے کو بے چین رہتا تھا۔ مگر اُس نے اُن پر پہرے بٹھا رکھے تھے۔ میں نے اپنے گرد لپٹے ہوئے تولیے کو الگ کیا اور اُس سے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن اُسی وقت اُس کی آواز آئی۔ ''کیا ہوا؟ خاموش ہو گئے؟''

''شام سات بجے میرے گھر پر آ جانا۔ پہلے نہیں۔ میں شوٹنگ پر ہوں۔''

مونا سنگھ چوہان میرے فلیٹ پر میرے سامنے براجمان تھی۔ اِس لمبے عرصے میں عمرِ عزیز نے اُس پر کوئی اثر نہ چھوڑا تھا۔ بدن، چہرہ اور حُسن جوں کا توں برقرار تھا۔ وقت کے بیت جانے پر بھی وہ ویسی ہی کشش رکھتی تھی، جب پچھلی بار میرے گھر پر آئی تھی۔ اور اب وہ ایک نہایت ہی آرام دہ صوفے پر شاہانہ انداز میں بیٹھی خاموش نظروں سے مجھ کو تک رہی تھی۔ لیکن اُن میں دعوت کی جھلک بھی کہیں پوشیدہ تھی۔ میں اِس تذبذب میں تھا کہ اُس کے ساتھ کیسا برتاؤ کروں؟ پھر اُس نے کشادہ لاؤنج کی آرائش، جدید فرنیچر اور دیواروں پر لٹکتی تصویروں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ایک سفری بیگ بھی اُس کے قریب رکھا تھا۔ لیکن میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ کیوں لے کر آئی ہے؟ کہیں وہ گھر سے بے گھر تو نہیں ہو گئی؟ شاید چند روز میرے ہاں قیام کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟ میں اِن خیالات میں گُم تھا کہ آواز آئی:

''میرا ٹھکانا وہی ہے، جو پہلے تھا۔'' اُس نے یقیناً میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔ ''تمہارا فلیٹ کمال کا ہے۔ اب تم بڑے آرٹسٹ بن چکے ہو۔ ڈائریکٹر، پروڈیوسر اور ایجنٹ سب تمہاری سنتے ہیں؟''

''ہاں، یہ تو ہے... لیکن میری کامیابی کا سہرا میرے دوست ڈینی کو جاتا ہے۔ ورنہ میں تو سڑک پر آ چکا تھا۔''

''تم لکی ہو۔ تمہارا کوئی دوست تو ہے، جو بُرے دنوں میں تمہارے ساتھ کھڑا رہا۔''

اتنا کہہ کر وہ چھت کے درمیان لٹکتے جھومر کو تکنے لگی۔ وہ نایاب بھی تھا اور قیمتی بھی۔ میں اُسے شہر پراگ سے لے کر آیا تھا، تب چتری بھی میرے ساتھ ہالی ڈے پر گئی تھی اور ہم نے وہاں بہت مزے کیے تھے۔ لیکن مونا کو کچھ بتانے کی بجائے میں اُس کا چست لباس دیکھ رہا تھا، خاص طور پر اُس کی چمڑے کی مِنی اسکرٹ۔ وہ ٹانگیں قدرے پھیلائے بیٹھی تھی اور اُس کا سرخ انڈر ویر صاف صاف دِکھ رہا تھا۔ میری نظریں وہاں سے ہٹ نہیں پا رہی تھیں۔ اِس کا احساس اُس کو ہوا تو وہ پہلو بدل کر بول اُٹھی:

''میں نے دو تین سیریل میں چھوٹے چھوٹے رول کیے تھے؟''

''جانتا ہوں... مگر بات کچھ بنی نہیں؟''

''ہاں، اِن دنوں میرے پاس کوئی سیریل نہیں ہے۔ تمہاری چوکھٹ پر آنے کی وجہ بھی یہی ہے.... مجھے یاد ہے تم نے کہا تھا۔ جیون میں کچھ پانے کو کچھ کھونا بھی پڑتا ہے اور اب میں بالکل تیار ہوں۔'' اُس نے مِنی اسکرٹ کے ساتھ چمڑے کی جیکٹ بھی پہن رکھی تھی اور اُس کے نیچے ڈوری سے بندھا کسا کسا بلاؤز بھی تھا۔ درمیان کے بٹن کھلے تھے اور اُس کی چھاتیاں اپنی گولائیوں کے ساتھ باہر کو اُمڈ رہی تھیں۔ مجھ کو پورا یقین ہو چکا تھا کہ شکار خود ہی گشت کرتا ہوا میرے دام میں چلا آیا ہے اور اُس کے پَر کاٹتے ہوئے میں اپنی دیرینہ پیاس بجھا پاؤں گا، کچھ اِس طرح کہ وہ ہر تیسرے چوتھے روز میرے در پر سجدہ کرتی پھرے۔ وہ اچانک بول اُٹھی۔ ''میں آج بھی ورجن ہوں۔ اگر میں نے تمہاری بات مان لی ہوتی تو آج اِس گھر کی مالکن ہوتی۔ شاید ہمارا کوئی بچہ بھی ہوتا؟''

چند برسوں میں زمانے نے اُس کو کافی ہوشیار بنا دیا تھا۔ وہ سچائیوں کو قریب سے جان کر اپنی ذات سے باہر نکل آئی تھی اور بے باک بھی ہو گئی تھی۔ یہ سب محسوس کرتے ہوئے میں اُس سے پوچھ بیٹھا:

''یہ بتاؤ اِس پل میں تمہارے واسطے کیا کر سکتا ہوں؟''

''میں نے کہا نا۔ میں ورجن ہوں۔ تم کو دل سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر فیل ہو گئی۔ خود کو تمہارے واسطے اب تک بچا کر رکھا ہے۔''

''تم بہت سمجھ دار ہو مونا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی قمیض کے بٹن آہستہ آہستہ کھولنا شروع کر دیئے۔

''تم چاہو تو میں تم سے معافی مانگ کر اِسی وقت شادی کرنے کو تیار ہوں۔''

میرے چلتے ہوئے ہاتھ رُک سے گئے۔ اور میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا:

''لیکن میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔''

''کیوں؟ کوئی کمی ہے مجھ میں؟''

''بالکل نہیں۔ تم جیسی حسین عورت تو میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔''

''تو پھر؟''

''میں تمہارے بدن سے پوری طرح واقف نہیں ہوں... دوسری بات، تمہارے ساتھ میرا کوئی ذہنی تال میل نہیں ہے اور تیسری بات، میں چتری سے شادی کروں گا۔''

''چتری؟ کون چتری؟ نئی گرل فرینڈ ہے؟''

''نہیں، تم سے بھی پرانی... تم اُس کو جانتی ہو۔ اُس کا نام ایملی ہے۔ تم اُس کے ساتھ بلڈنگ سوسائٹی میں کام کرتی رہی ہو؟''

''او مائی گاڈ۔'' وہ صوفے سے اُچھل سی پڑی اور فضا میں چتری کا حُلیہ ہاتھوں سے بنا کر، تحقیر آمیز لہجے میں بولی: ''وہ بھاری سی، بھدی سی، کراس بریڈ۔ آدھی ویسٹ انڈین، آدھی انگلش۔ چہرے پر کالے، خاکی سپاٹ۔''

چتری کے متعلق اُس کا رویہ مجھے پسند نہ آیا تھا۔ لیکن میں کڑوا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

''ہاں، ایملی ہی چتری ہے۔ وہ سونے کا دل رکھتی ہے۔ مکر و فریب سے پاک... میری ہر مصیبت میں کندھا ملا کر ساتھ کھڑی رہی ہے۔ اور سب سے بڑی بات، اُس کے بدن سے شعلے نکلتے ہیں جو مجھ کو زندہ رکھتے ہیں۔''

وہ دیر تک سوچ میں غرق رہی۔ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کامیابی اور شہرت کی جس سیڑھی پر میں کھڑا ہوں، وہاں چتری کا کیا کام؟ وہ کئی جنم لے کر بھی وہاں نہیں پہونچ سکتی؟ پھر جلد ہی اُس نے اپنا موڈ

بدل لیا تھا۔ دھیرے دھیرے اُس نے اپنے بلاؤز کی لٹکتی ڈوری کی گانٹھ کو کھولنا شروع کر دیا تھا۔ زیرِ لب بولی:

''خیر یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے اور ذاتی پسند بھی... مجھ کو کام چاہیے، وہ بھی فوراً... اور اِس سمئے میں اُوپر سے نیچے تک تمہاری ہوں۔''

میں اپنی جگہ سے اُٹھا۔ قمیض اُتار کر میں نے فضا میں لہرائی۔ وہ اُڑتی ہوئی ٹیلی ویژن اور اُس کی اسکرین پر پھیل گئی۔ اِس دوران وہ بھی جیکٹ اُتار چکی تھی۔ مرمریں بازو اپنا جادو جگا رہے تھے۔ اگلا پل برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن جونہی میں نے اُس کی طرف قدم اُٹھایا۔ ایک اُچھلتی ہوئی کُرسی اچانک میرے سر کے اُوپر سے ہو کر گزر گئی اور میں بال بال بچ گیا۔ پچھلی ملاقات کا پورا منظر میرے سامنے فلم کی طرح شاٹ در شاٹ چل نکلا تھا۔ اُس نے میرے ہی گھر میں مجھ کو جس سطح پر ذلیل اور بے عزت کیا تھا، وہ اپنی مثال آپ تھا۔ بھلائے نہ بھولتا تھا۔ سوچا، حُسن کی اِس دیوی کو Deflower کرتے وقت، اُس کے بدن پر اتنے نشان چھوڑوں کہ ہر نشان اُسے یاد دلائے کہ پچھلی ملاقات میں اُس نے میرے ساتھ کیا کیا کیا تھا؟ لیکن میرے دماغ نے، میرے دل سے ہم آہنگ ہو کر سوچ کی ایک نئی روش اختیار کر لی تھی اور میں خود پہ سخت حیران تھا۔ وہ بڑی نزاکت سے بلاؤز کی ڈوری کھولے جا رہی تھی۔ میں اُس کی اداؤں سے لطف اندوز بھی ہو رہا تھا کہ میں اچانک بول اُٹھا:

''ڈوری اور مت کھولنا؟''

وہ حیران پریشان سمجھ نہ پائی کہ میں نے یہ بول کیوں ادا کیے ہیں؟ جبکہ وہ اپنی مرضی سے خود سپردگی کے عمل سے گزرنا چاہتی ہے۔ پھر یہ سب...؟

''تم ورجن ہو... اور تمہاری سزا بھی یہی ہے کہ تم ورجن ہی رہو... وقت کے بدلنے پر اب میں اِتنا سستا نہیں رہا کہ تم میرے بدن کو چھو پاؤ... اب تم جا سکتی ہو؟''

وہ پتھرا چکی تھی۔ میں اُس کا غرور پاش پاش کر کے اپنا انتقام لے چکا تھا۔ وہ بُت جتائے جا رہا تھا کہ وہ مدتوں سے وہاں ساکت و جامد کھڑا ہے اور کھڑا ہی رہے گا۔ لیکن میں اپنی جگہ بے حد

خوش تھا کہ چتری کو جب اِس کھیل اور اُس کے کلائی میکس کا پتہ چلے گا تو وہ شرطیہ مجھ کو فخر کی نظر سے دیکھے گی کہ اب کنوارا بدن بھی میرے نزدیک اپنی اہمیت کھو بیٹھا ہے، اِس لیے کہ عورت کے ساتھ اگر کوئی جذباتی یا ذہنی لگاؤ نہ ہو تو پھر وصال کے کیا معنی؟ وہ کس کام کا؟

ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہ بیتے تھے کہ چتری میری رہائش گاہ پر موجود تھی۔ نیشا بھی اُس کے ہمراہ آئی تھی۔ وہ جب کبھی میرے ہاں آیا کرتی تو بلا کسی روک ٹوک کے، ایک کمرے سے دوسرے میں بھاگتی دوڑتی پھرتی۔ اُس کی عمر بڑھ رہی تھی اور عقل بھی۔ چتری اتفاق سے اُسی صوفے پر براجمان تھی، جہاں پچھلی شام مونا بیٹھی ہوئی تھی۔ میں چتری کو پورا قصہ من وعن بیان کر چکا تھا۔ وہ ہر پہلو غور سے سُن کر بے انتہا خوش ہوئی تھی کہ میں نے ہمیشہ کے لیے حدِ فاصل کھینچ ڈالی ہے اور اب میدان اُس کے واسطے بالکل صاف ہو چکا ہے۔ فخریہ مجھ کو دیکھ کر بولی:

''چلو، آج میں تم کو ٹریٹ (Treat) کرتی ہوں۔ کسی ٹاپ ریسٹورنٹ میں۔ ٹیبل بُک کرلو۔'' میں نے آکاش ریسٹورنٹ والوں کو فون کیا تو ریسٹورنٹ کے خادم نے جاننا چاہا کہ وہ ٹیبل کس نام سے بک کرے۔ بے ساختہ میں نے جواب دیا: ''مسٹر اینڈ مسز رتن کمار۔''

چتری صوفے سے اُچھل سی پڑی۔ تیزی سے میرے قریب آئی اور اپنی باہیں میری کمر میں ڈال کر میری پُشت سے چپک گئی۔ بھرپوری طاقت سے مجھ کو بھینچ ڈالا۔ لگا کہ میں کسی اسٹیم رولر کر زد میں آ گیا ہوں۔ میں ریسٹورنٹ والوں کو اپنے آنے کا وقت لکھوا رہا تھا کہ میرے کندھے کی پُشت پر چتری نے زور سے کاٹ ڈالا۔ میں نے اُف تک نہ کی۔ بلکہ درد سے مسرور ہو کر اتنا ضرور کہا: ''ذرا اور زور سے۔''

☆☆

پرورٹ

کل رات بھی وہی ہوا جو پہلی بار میرے جوان ہونے پر ہوا تھا۔ میرا آنے والا بچہ شکل اختیار کرنے سے پہلے ہی چل بسا تھا۔ صبح اُٹھ کر بستر کا جائزہ لیا تو سلیٹی رنگ کی چادر پر بے شمار چھوٹے بڑے دھبے نقشوں کی صورت میں پھیلے ہوئے تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ اُنھیں دیکھ کر ایسا لگا کہ بڑا دھبہ تو کوئی عظیم ملک ہے جس کے اِردگرد چھوٹے بڑے جزیرے پھیلے ہوئے ہیں اور وہ سبھی معاشی، تہذیبی اور معاشرتی اعتبار سے عظیم ملک کے رحم و کرم پر ہیں۔

میرا بچہ جب اس پرکار مجھ سے بچھڑتا تو میں دن بھر پریشان رہتا۔ میرے سینکڑوں بچے ضائع ہو چکے تھے۔ اُن کے متعلق سوچتے ہوئے مجھ کو دکھ بھی ہوتا اور افسوس بھی۔ کام کے دوران یہ خیال بھی ذہن سے گزرتا کہ جس رفتار سے میرے بچے ضائع ہو رہے ہیں، میں شادی بیاہ سے پہلے ہی خالی ہو کر رہ جاؤں گا۔

شام کو دفتر سے فارغ ہو کر میں جہانگیر آرٹ گیلری کی طرف چل دیا۔ وہاں مایا بنسل میرا انتظار کر رہی تھی۔ قریب قریب روز اُس سے میل ملاقات رہا کرتی تھی۔ وہ جب سے میرے

جیون میں وارد ہوئی تھی، میرے جیون کا نقشہ ہی بدل کر رہ گیا تھا۔ چادریں کم کم آلودہ ہوا کرتی تھیں۔ پھر میں نے ہاتھوں سے فطری گناہ کرنا بھی بند کر دیا تھا۔ میں اُوپر والے کا شکر گزار بھی تھا کہ میں اُس لذتی کھیل سے صاف صاف بچ نکلا تھا۔ ورنہ جوں ہی چیونٹیاں میرے بدن میں منھ کھولا کرتیں، میں اُن کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنے ہاتھ فطری گناہ میں ملوث کر لیتا۔ لیکن اُس لذتی کھیل سے کنارہ کش ہوتے وقت ایک اہم سوال میرے ذہن میں پنجے ضرور گاڑ بیٹھا تھا، جس کا جواب محض صنفِ نازک ہی کے پاس تھا اور وہی اس کا جواب دینے کی اہل بھی تھی۔ لیکن میں وہ سوال پوچھنے سے بدکتا تھا اور محتاط بھی رہا کرتا تھا۔ لیکن وہ میرے باطن میں اکثر ہلچل مچائے رکھتا۔ میں نے مایا سے وہ سوال پوچھنا بھی چاہا تھا مگر صحیح موقع کا انتظار ہی رہا۔ اکثر پوچھتے وقت کوئی نہ کوئی اڑچن پیدا ہو جاتی۔ کبھی اُس کی فرینڈز میں سے جیوتی، نجمہ، کرشنا، لکشمی، بیلا چلی آتی، کبھی اُس کا موبائل فون بج اُٹھتا، اور کبھی وہ "PEE" کرنے کو چلی جاتی۔ کبھی ویٹر چائے لے کر آ جاتا اور میرا سوال لبوں پر ہی رہ جاتا۔ لیکن مایا کی صحبت اور دوئی کو اِکائی میں بدل کر مجھے بہت فائدے بھی ہوئے تھے۔ اول تو یہ کہ میں اُس کے وسیع فرینڈلی سرکل کو بہت قریب سے جان گیا تھا۔ اُس کی تمام فرینڈز میری بھی فرینڈز بن گئی تھیں۔ وہ سب مجھ کو مایا کے مقابلے میں زیادہ پسند کرنے لگی تھیں۔ فیاض دل اور کھلا ذہن رکھنے کے کارن مجھ سے کھلے مذاق بھی کر لیا کرتی تھیں۔ اُن کی مسکراتی نگاہوں میں بہت کچھ پوشیدہ رہا کرتا، اور مجھ جیسے مجرد کو صحیح موقع کا انتظار بھی رہتا۔ میں بھی اُن کو قسم قسم کے فحش اور دلچسپ لطیفے سنا کر اپنی طرف متوجہ کر لیا کرتا۔ لیکن مایا مجھ کو اُن کی سنگت میں پا کر زیادہ خوش نہ ہوا کرتی۔ اُس کا گلنار چہرہ بے رنگ ہو کر رہ جاتا۔ اُس کی فرینڈز اس بات کو بہت قریب سے محسوس کیا کرتیں۔ بیلا سنہا مجھ کو انتباہ کرتی:

''شیرنی اُس میز پر اکیلی بیٹھی سگریٹ پھونک رہی ہے اور بیئر سے دل بھی بہلا رہی ہے، مگر اُس کی آنکھ تم پر جمی ہے .... بہتر ہوگا یہاں سے اُٹھ کر اُس کے پاس چلے جاؤ، ورنہ مارے جاؤ گے!''

اور میں بادلِ ناخواستہ اُن کی میز سے اُٹھ کھڑا ہوتا۔ لیکن الگ ہوتے وقت بھی کئی ملے جلے جملے

کانوں میں پڑتے۔ نجمہ صدیقی کہا کرتی:
''مایا شکی مزاج تو ہے ہی، سالی possessive بھی نمبر وَن ہے۔ اپنی خوبصورتی کے سبب مغرور بھی بہت ہے۔''
''اور خود کو پہلے درجے کی انٹیلکچول بھی سمجھتی ہے۔ جب کہ سالی ہے نہیں، بنتی ہے۔''
بیلا کے انکشاف پر ریسٹورنٹ میں مشترکہ قہقہہ بکھر جاتا اور میں بھی اُس میں شریک ہو کر لطف اُٹھاتا۔ لیکن میں مایا کی ذہانت اور ذکاوت کا قدر دان بھی تھا۔ اُس کے تجربات اور مشاہدات خاصے وسیع تھے۔ وہ دور اندیش بھی تھی۔ بڑی پابندی سے مخصوص قسم کی گولی (Pills) استعمال کر کے خود کو اور مجھ کو ہر خطرے سے آزاد رکھا کرتی تھی۔ ابتدا میں جب ہم شدت سے ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے تو بھوگ ولاس کے دوران اُس نے مجھے کونڈوم استعمال کرنے پر مجبور کیا تھا۔ لیکن میں نے اِس بنا پر اُس کا اصرار رد کر دیا تھا کہ آتماؤں کے ملاپ کے دوران اس غیر فطری شے سے آنند نہیں ملتا۔ اس پر وہ آنکھوں پہ کالا چشمہ دُرست کر کے بول اُٹھی تھی:
''آنند تو مجھے بھی نہیں ملتا۔ مگر کیا کریں؟ مجبوری ہے ...... بچے کی پرورش کون کرے گا؟ ..... تم مشکل سے اپنا پیٹ بھر پاتے ہو..... میری یا بچے کی دیکھ بھال کہاں سے کرو گے؟''
بات اُس نے معقول کہی تھی۔ مگر اُس کے رویے نے میرے ہاں شکوک پیدا کر دیے تھے کہ مستقبل قریب میں ہم شاید ہی بدنوں کی گرمی کو محسوس کیا کریں گے۔ وہ بڑی سیانی تھی۔ میرا اُلجھا ہوا اور اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ میں کس کیفیت سے دوچار ہوں۔ مسکرائی اور آگے بڑھ کر FULL BLOWN KISS کا لطف اُٹھا کر میرے کان میں سرگوشی کی: ''تم کو ایک ماہ ٹھہرنا ہوگا۔ پھر کوئی فکر ہمارے نزدیک نہیں آئے گی۔'' اگلے روز وہ ڈاکٹر کے مطب میں تھی۔ گولی کا استعمال اس نے پابندی سے شروع کر دیا تھا۔ اس پر میں بہت خوش تھا۔ لیکن مجھ سے کہیں بڑھ کر وہ خوش ہوئی تھی۔
گیلری کا ریسٹورنٹ ریل گاڑی کے ایک لمبے ڈبے کی مانند تھا۔ وہاں ہر دم فنکار، مصور، ادیب، صحافی، فوٹو گرافر اور عام لوگ دکھائی دیا کرتے۔ میز مشکل سے ملا کرتی تھی۔ مگر وہاں مستقل گراہکوں اور ویٹروں کے درمیان موٹی ٹِپ اپنا کام کر جایا کرتی اور دونوں پارٹیاں

خوش رہتیں۔

ریسٹورنٹ میں داخل ہو کر میں نے ناک کی سیدھ میں نگاہ دوڑائی۔ مایا کچن کے قریب آخری میز پر براجمان تھی۔ اس کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میں بہت خوش تھا کہ وہ سوال جس نے مجھ کو مدت سے پریشان کر رکھا تھا، پوچھنے کا اس سے بہتر موقع پھر کبھی نصیب نہ ہوگا۔ لیکن اس کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے قریب کی میز پر ایک حاملہ عورت دکھائی دی۔ اُس کے اڈوانس اسٹیج سے واضح تھا کہ نیا مہمان کوئی روز میں آیا چاہتا ہے۔ عورت بچہ جننے پر اور اپنی تکمیل پا کر کس قدر خوش ہوتی ہے۔ لیکن اُسی وقت یہ خیال بھی میرے ذہن سے گزرا کہ وہ اپنی موجودہ حالت سے شاید یہ جتانا چاہتی ہے کہ وہ بانجھ نہیں ہے اور نہ ہی اُس کا شوہر نامرد ہے۔ مگر کون دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ نووارد بچہ اُس کے شوہر کا ہی ہو؟ یہ تو عورت ہی صحیح معنوں میں جانتی ہے بچے کا اصل باپ کون ہے؟ اور کہاں ہے؟

مایا بیئر سے دل بہلا رہی تھی۔ اُس نے ایک خالی گلاس میرے واسطے پہلے ہی سے میز پر رکھ چھوڑا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی اُس نے گلاس لبالب بھر دیا۔ گلاس ٹکرا کر اور چند گھونٹ حلق سے اُتار کر جب سوال پوچھنے کی ہمت مجھ میں در آئی تو میں نے آگے پیچھے نگاہ دوڑا کر تصدیق کر لی کہ میدان صاف ہے۔ لہٰذا میں نے پوچھا:

''یہ بتاؤ مایا۔۔۔ مرد کے جسم میں جب چیونٹیاں رینگ کر اُسے کاٹتی ہیں تو وہ اپنے ہاتھوں سے بچے کا خون کر ڈالتا ہے۔۔۔ مگر وہی کیفیت جب عورت پر طاری ہوتی ہے تو وہ کیا کرتی ہے؟''

سوال خطرناک تھا اور اُس کے نزدیک گھناؤنا بھی۔ اُس کا گلنار چہرہ بجھ سا گیا۔ چند پل بھی نہ بیتے تھے کہ اُس کا بدن آگ میں تپ اُٹھا۔ کرسی سے اُٹھ کر غصے میں بولی:

''تم پاگل ہو۔۔۔ بیمار ہو۔۔۔ پرورٹ ہو۔''

یہ کہہ کر اُس نے چند نوٹ میز پر پھینکے اور گلاس کو چھوئے بنا چل دی۔ میں سمجھ نہ پایا کہ آن کی آن میں یہ سب کیا ہو گیا ہے؟ میں نے تو اصلیت جاننا چاہی تھی کہ اِس سوال کا جواب صرف عورت ہی دے سکتی ہے۔ پھر اس میں پرورشن والی کون سی بات ہے؟ ہم حد درجہ بے تکلف ہیں۔ ہمارے

درمیان کوئی پردہ باقی نہیں رہا۔ مگر وہ پرورٹ کا خطاب دے کر یوں چل دی جیسے میں واقعی پیدائشی پرورٹ ہوں۔

کولابہ کی جس لاج میں میرا رین بسیرا تھا۔ وہاں آٹھ بائی دس فُٹ کا ایک کیبن نما کمرہ تھا، جہاں میں گذشتہ دو برسوں سے قیام پذیر تھا۔ لیکن اُس تنگ کمرے میں جیون گزارنے کا نہ تو مجھے کوئی افسوس تھا اور نہ ہی کوئی خوشی۔ اِس لیے کہ بمبئی جیسے مہانگر میں سر چھپانے کی کوئی جگہ مل جائے تو سمجھو بھگوان کے درشن ہو گئے۔ مگر لاج کے مالک کے ساتھ میرے مراسم بڑے دوستانہ تھے۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں مجھ سے کم کرایہ لیا کرتا تھا۔ اُس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ میں دیش کے ایک معروف انگریزی اخبار سے منسلک تھا۔ گو وہ کام عارضی اور جز وقتی تھا لیکن میں آزادانہ طور پر اتنے تیکھے مضامین لکھا کرتا کہ سرکاری کارندے اور شاہی نوکر میرا اتہ پتہ دریافت کرتے پھرتے۔

کپڑے تبدیل کر کے میں اپنی کیبن میں چار قدم آگے اور تین قدم پیچھے چہل قدمی کرتا رہا۔ ہر قدم اُٹھانے پر میں مایا اور اپنے سوال پر سنجیدگی سے غور و فکر کرتا رہا۔ یہ خیال بھی مجھ پر حاوی تھا کہ جس انداز میں وہ آگ بگولا ہو کر اُٹھی تھی اور میرے گلے میں پرورٹ کا طوق ڈال کر چل دی تھی، اب شاید ہی ملنا پسند کرے۔ میری سوچ کا عمل جاری تھا کہ ساتھ والی کیبن سے چند ملی جلی رومانی سرگوشیاں اور آوازیں تاریک فضا میں اُبھریں۔ میری نا امیدی، مردہ دلی اور یاسیت وقتی طور پر غائب ہو گئی۔ ساتھ والی کیبن میں ایک نو بیاہتا پارسی جوڑا چند روز سے ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ لوگ ہنی مون منانے دانو روڈ سے آئے تھے۔ میں ایک آنکھ بند کر کے پلائی ووڈ کے سوراخ سے اُن کی جنسی سرگرمیوں کا جائزہ لیا کرتا تھا۔ وہ کام سوترا اور کھجراؤ کے آسنوں کو عملی شکل دیا کرتے تھے۔ اُن کی اُٹھا پٹک سے میرے اندر چیونٹیاں منہ کھول بیٹھتیں۔ من چاہتا کہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی اولاد کو قربان کر دوں، مگر ایسا کرنا میں گناہ سمجھتا کہ اپنی ہی عدالت میں بطور مجرم کھڑا ہوتا۔

اگلی شام ہفتے کی شام تھی۔ میں حسبِ معمول مایا سے ملنے گیلری کی طرف چل دیا۔ اِس اُمید پر کہ چوبیس گھنٹوں میں اُس کا غصہ کافی حد تک دور ہو چکا ہوگا۔ چھوٹی موٹی ناراضگی

ضرور ہوگی۔ اُس نے منہ بھی پھلا رکھا ہوگا۔ لیکن جب میں اُسے منانے کی کوشش کروں گا تو وہ منطقی بات چیت اور نرم گرم مکالمے کے بعد یقیناً مان جائے گی۔ پھر ہم ہر ویک اینڈ کی طرح، اندھیرا گہرا ہونے پر اُس کے YWCA کے کمرے میں ہوں گے، جہاں ہر قسم کا آرام اور سہولت رہتی ہے اور اکثر وصال کے دوران پاک روحیں مسرت کے نغمے گایا کرتی ہیں۔

گیلری کا ریسٹورنٹ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ویٹر خوش تھے۔ میں نے مایا کو تلاش کیا اور اُسے فیروز کے ساتھ بیٹھا ہوا پایا۔ فیروز موٹروں کا تاجر تھا۔ اُس شخص کی ایک اضافی خوبی یہ تھی کہ بہت سی گمنام اور ناکام فلمی اداکارائیں اُس کی جیب میں رہا کرتیں۔ ایک مختصر سے فون پر اداکارہ جائے مطلوب پر کھلی مسکراہٹ کے ساتھ حاضر ہو جاتی اور اُس کا پرس نوٹوں سے بھر جاتا۔ میں فیروز کو اُن ایام سے جانتا تھا جب وہ فُٹ پاتھ پر تاش کے پتوں کو پھینٹتا ''ستہ اندر، ستہ باہر۔ دو کا چار، چار کا آٹھ'' بنانے کا کھیل کھیلا کرتا تھا اور اپنی چرب زبانی سے راہ گیروں کی جیب صاف کیا کرتا تھا۔ اُس نے کرسی سے اُٹھ کر نہایت گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ مگر مایا کو ہم دونوں کا رویہ پسند نہ آیا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی وہ چلا اُٹھی تھی:

" I HATE THAT BASTARD, WHO HAS A FILTHY MIND"

(میں اُس حرامی سے نفرت کرتی ہوں، جو گندا ذہن رکھتا ہے۔)

اُس کے لہجے کی آگ اتنی تیز تھی کہ میرے شریر کے بال ساتھ چھوڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں نے مزید وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا، اُن کو دیکھے بغیر ریسٹورنٹ سے چلا آیا اور گیلری کی بیرونی سیڑھیوں پر آن بیٹھا۔ سگریٹ پھونکتا برابر سوچتا رہا کہ مایا کے ساتھ مجھ کو اپنا تعلق رکھنا چاہیے یا ختم کر لینا چاہیے؟ ایسی ذلت میں نے کبھی برداشت نہ کی تھی۔ میری گردن سیڑھیوں میں دھنس چکی تھی اور میں پرورٹ، باسٹرڈ، فلتھی مائنڈ جیسے خطابات پر غور کر رہا تھا کہ آئے دن اُن میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میں کش پہ کش لیتا اپنی توہین سے الگ ہونے میں کوشاں تھا کہ اتنے میں ایک ٹیکسی سیڑھیوں کے قریب آ کے رکی۔ ڈرائیور نے بریک زور سے لگائی تھی۔ دیکھا تو جیولی ڈی کاسٹا ٹیکسی سے اُتر رہی تھی۔ میں مایا کو چند پل کے لیے بھول سا گیا۔ جیولی بلا کی جوان تھی۔ کسا ہوا

بدن اپنی طرف کھینچتا ہوا۔ وہ عجب مختصر سالباس پہنا کرتی تھی۔ ٹانگیں، رانیں، کمر کا حصہ اور بازو بہ یک وقت نمائش کیا کرتے تھے۔ مگر وہ اکثر شکایت کیا کرتی کہ اُسے اِس لباس میں گرمی لگا کرتی ہے۔ ایک روز میں نے اُس سے پوچھ ہی لیا تھا:

''شادی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

اُس نے ہلکی سی چپت میرے گال پر رسید کی تھی اور مسکرا کر یوں کہا تھا، گویا وہ مجھ کو انتباہ کر رہی ہو:

''ابھی ہماری عمر ہی کیا ہے؟ ابھی ہم کو بہت کچھ دیکھنا ہے؟''

میں فوراً ہی اُس کے جملوں کی تہہ تک پہونچ گیا تھا۔ بولا:

''ٹھیک کہتی ہو۔ ابھی ہم نے دیکھا ہی کیا ہے؟''

ٹیکسی کے میٹر پر گہری نظر ڈال کر جیولی نے بیگ میں سے چند نوٹ نکالے اور ڈرائیور کی طرف بڑھا دیے۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوئیں تو اُس کے موٹے موٹے لبوں پر جس قسم کی مسکراہٹ اُبھری، اُس سے عیاں تھا کہ وہ میرے متعلق چند تازہ معلومات رکھتی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں شرارت تھی اور ہونٹوں پر گہرا طنز۔ اپنا جھولتا ہوا پرس میرے سینے پر دے مارا، پھر بولی:

''ہیلو مسٹر پرورٹ!''

سر پر بم گرتے ہی میں اتنا سنجیدہ ہو گیا کہ جیولی کا چہرہ بجھ کر رہ گیا۔

''تم تو برا مان گئے۔ میں نے تو ایسا سوچا بھی نہ تھا...... مجھے معاف کرنا۔''

''ایک شرط پر؟''

''کیا؟''

''یہ شام تم میرے ساتھ گزارو!''

''کاش میں ایسا کر سکتی...... اندر راکی بیٹھا میری راہ دیکھ رہا ہے۔''

''راکی کون؟ وہ تمھارا بوائے فرینڈ؟''

''ہاں! وہی باکسر، میری لائف میں پھر سے لوٹ آیا ہے۔ وہ جان گیا تو تم کو پہلے راؤنڈ میں ہی ناک آؤٹ کر ڈالے گا...... بائے!''

وہ کھلکھلاتی، ہوا میں اُڑتی گیلری کی سیڑھیاں طے کر گئی اور میں پھر سے تنہا ہو گیا۔ پورٹ کا خطاب میرے گلے میں جھولتا ہی رہ گیا۔

ریگل سنیما جو گیلری کے قریب ہی تھا، وہاں "How to conquer your wife" نام کی فلم چل رہی تھی۔ فلم کی رپورٹ ٹھیک ٹھاک تھی۔ اُس میں عورت ذات کو جیتنے کے کئی آزمودہ گُر دکھائے گئے تھے اور طرح طرح کے سبق بھی موجود تھے۔ سوچا ان کی مدد سے مایا کو رام کرنے میں آسانی ہو گی۔ مگر بدقسمتی سے ہاؤس فُل تھا۔ بہت سے لوگ ایکسٹرا ٹکٹ کے لیے دوسروں سے پوچھ رہے تھے۔ ایک بھیڑ سی تھی اور اُس بھیڑ میں نجمہ صدیقی بھی موجود تھی۔ وہ بے حد حسین عورت تھی۔ عمر یہی بائیس چوبیس برس۔ مگر اس کی حساس آنکھیں ہر دم سنجیدہ رہا کرتیں، جن کے پیچھے اُس کی پیاس اپنا رول ادا کرتی دکھائی دیتی۔ اُس کا چہرہ ایسا درپن تھا جس میں اس کا آتمائی دکھ متواتر جھلکتا رہتا۔ دوستوں کا خیال تھا کہ وہ ازل سے پیاسی ہے اور اُس کے غیر مطمئن باطن میں ہلچل سی مچی رہتی ہے۔ سکون پانے کو وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا کرتی ہے۔ مگر ہر نووارد اپنی پیاس بجھا کر اُسے پیاسا چھوڑ جاتا ہے۔ اُسے بھی یہی شکایت تھی کہ مرد اُس کے جسم سے بڑھ چڑھ کر پیار کرتے ہیں مگر اُس کی روح کے نزدیک کوئی بھولے بھٹکے بھی نہیں جاتا۔ دنوں میں ہی اُس کا کرب اتنا بڑھ جایا کرتا کہ وہ خود کو موت کے دہانے پر کھڑا پاتی۔ ایک بار اس نے کافی مقدار میں خواب آور گولیاں بھی کھالی تھیں۔ مگر بروقت اس کی والدہ کو اپنی بیٹی کی احمقانہ حرکت کا علم ہو گیا تھا۔ نجمہ مجھ کو بہت پسند کرتی تھی، اس لیے کہ میرے خیالات میں اُسے سچ ہی سچ دکھائی دیتا۔ ایک بار میں نے اس سے کہا تھا:

''اِس دور میں آدمی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ سکون پانے کی خاطر دربدر بھٹکتا ہے، مگر سکون اس سے کوسوں دور بھاگتا ہے..... جانتی ہو کیوں؟''

''آدمی جھوٹ، مکروفریب، خود غرضی، کمینہ پن، لالچ، ریاکاری، دوہرے معیار اور امارت پسندی سے الگ نہیں ہو پاتا۔ اپنی خواہش کی خاطر دوسروں کو زک پہنچاتا ہے......اور ذاتی فائدہ اُٹھانا اس کی فطرت رہی ہے۔''

نجمہ کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اس کے دائیں ہاتھ میں کوئی مذہبی کتاب تھی اور بائیں کندھے پر پرس لٹک رہا تھا۔ گیلری میں اُس پرس کے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور تھیں کہ اس میں مال ومتاع تو ہوا ہی کرتا ہے، بھانت بھانت کے کونڈوم بھی ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ اُس کی فرینڈز ایمرجنسی میں اس سے مستعار بھی لیا کرتیں۔

مجھ کو فاصلے سے اپنی طرف آتا دیکھ کر نجمہ خوش ہوگئی۔ ہونٹ پھیلا کر میرا خیر مقدم کیا۔ مگر اُس شام میرے ستارے گردش میں تھے۔ وہ دوستوں سے میل نہیں کھا رہے تھے۔ اچانک نجمہ کا نیا عاشق منظر پر چلا آیا۔ میں اس کے متعلق کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اس کے نام سے واقف تھا۔ اُس نے ہاتھ میں ٹکٹ تھام رکھے تھے اور وہ نجمہ کے بازو میں بازو ڈال کر تھیٹر کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن نجمہ نے قدم اُٹھانے سے پہلے مُڑ کر مجھ کو دیکھنا ضروری سمجھا۔ اُس کی مسکراتی بامعنی آنکھیں سرِ راہ مجھ سے کہہ رہی تھیں: ''ہیلو مسٹر پرورٹ''

میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ سر پر ایک اور بم آن گرا۔ دل نے چاہا کہ ریسٹورنٹ میں جا کر مایا کا کھلے بندوں خون کر ڈالوں۔ اُس کمینی عورت نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ اتنے بھونڈے طریقے سے رسوا کیا تھا کہ میں دوستوں کی نظروں میں گندا انڈا بن چکا تھا، جسے ہر کوئی ڈسٹ بن کی نذر کر دیتا ہے۔ میں خود میں کھولتا اور غصے میں جلتا ہوا انڈیا گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ انگریزوں کا تعمیر کردہ نادر نمونہ نو آبادیاتی دور کی دین تھا۔ میں جلتا کڑھتا اکیلے پن کو سینے سے لگائے اُس تاریخی مقام کی طرف بڑھ گیا۔ اُسے سن ۱۹۱۱ء میں کنگ جارج پنجم اور کوئین میری کی آمد کی خوشی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اگر وہ دہلی دربار میں شرکت کرنے ہندوستان نہ آتے تو آن بان شان سے کھڑا ہوا گیٹ وے آف انڈیا کبھی وجود میں نہ آتا۔ ہر شام یہ عمارت تفریح گاہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور جوق در جوق لوگ وہاں زیارت کی غرض سے چلے آتے ہیں۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے قریب سے گزرتا ہوا ہر شخص میری اصلیت کو جان گیا ہے کہ میں پرورٹ ہوں۔ میں بھیڑ اور عوام کی نظروں سے سخت پریشان ہوا جا رہا تھا۔ سوچا کہ اس سپاٹ بھیڑ سے خود کو الگ کر لوں، جس کا نہ تو اپنا کوئی چہرہ تھا اور نہ ہی کردار۔ قریب ہی علی بابا ریسٹورنٹ تھا۔ میں

نے اُس طرف قدم اُٹھایا ہی تھا کہ فیروز کی تیز رفتار ایم جی کار میرے قریب سے گزری۔ مایا اُس کے برابر بیٹھی ہوئی تھی اور اُس کے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ کار تاج محل ہوٹل کی اینکسی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں کچھ دیر بُت بنا وہیں کھڑا رہا، پھر حقارت سے تھوک سڑک پر پھینک کر ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔ موسیقی کی ملی جلی آوازیں کانوں سے ٹکرائیں۔ بھارتی سازندے مغربی ساز بجا رہے تھے۔ کوئی بیرونی دُھن فضا میں جادو جگا رہی تھی۔ ہال میں نیم اندھیرا تھا۔ رومانی ماحول تھا۔ فلور پر پنڈلیاں تھرک رہی تھیں۔ بدن ایک دوسرے سے چپکے رقصاں تھے۔ ہر آنکھ میں دعوت تھی اور ہر ہونٹ پر اقرار تھا۔ صرف وقت اور موقع کا انتظار تھا۔ چاروں طرف کا نظارہ آنکھوں میں اُتر جانے پر مجھے بیلا سنہا بھی وہاں دکھائی دی۔ وہ ایک کونے میں بیٹھی سگریٹ پھونک رہی تھی اور دھواں لاپرواہی سے ساتھ کی میزوں پر چھوڑ رہی تھی۔ اُس ناآسودہ عورت کی عجب کہانی تھی۔ اُس کے بارے میں جب میں سوچتا تو اُس کی زندگی کے دردناک واقعات کو کتابی شکل میں پیش کرنا چاہتا۔ وہ جن حالات میں پیدا ہوئی تھی اور جس طریقے سے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوئی تھی، وہ دل کو دہلا دینے والے تھے۔ وہ نادار والدین کی تین بیٹیوں میں سے ایک تھی۔ چھٹی دہائی کے آخر میں جن دنوں صوبہ بہار میں قحط پڑا تھا تو بیلا کے والدین کے پاس مٹھی بھر دھان تک نہ تھا۔ وہ بذاتِ خود بھی ماں کے دودھ سے محروم تھی۔ کسی دھنوان نے اس ادھ موئی بچی کے دام پچاس روپے لگائے تھے اور لاچار والدین بچی کے جیون کی خاطر انکار نہ کر پائے تھے۔ دنوں میں ہی اُس بچی کی بند آنکھیں کھل گئی تھیں اور مرجھایا ہوا پھول خوشبو دینے لگا تھا۔ خریدار نے پورے گیارہ برس تک انتظار کیا تھا اور بیلا جس شخص کو اپنا باپ تصور کرتی تھی، اسی کے ساتھ اُسے پہلا جنسی تجربہ حاصل ہوا تھا۔ کچی کلی چیخ کر رہ گئی تھی، پھر ہر رات وہ چیختی رہی۔ اس نے اپنے بچاؤ کی خاطر سہارے تلاش کیے مگر وہ موقع شناش، بدچلن اور ہوس پرست ثابت ہوئے۔ انجام کار پٹنہ شہر چھوڑتے وقت جو واجبی تعلیم اُس نے پائی تھی، وہی اس کا واحد سہارا تھی۔ قدرت نے اُسے خداداد صلاحیتیں ضرور بخشی تھیں۔ اُس نے بلا کا تخلیقی ذہن پایا تھا۔ اُس نے ایک تصویر بنائی تھی، جس میں عام لوگ صلیبوں پر لٹکے ہوئے تھے مگر وہ سب کے سب زندہ تھے۔ اُن کے سروں پر

ایٹم، میزائیل، راکٹ، بم، جنگی جہاز اور عالمی کرنسی کے نوٹ لٹک رہے تھے۔ یسوع مسیح زمین پر کھڑے مسکرا رہے تھے اور اُن کے حواری اور پیروکار پیچھے کھڑے تالیاں پیٹ رہے تھے۔

میں بیلا کو دوستوں کے حلقے میں سب سے زیادہ پسند کرنے لگا تھا۔ وہ ایک جیتی جاگتی کتاب تھی، جسے بہ آسانی کیش کیا جا سکتا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی مگر حد درجہ مجھ سے بے تکلف تھی۔ اپنے انوکھے جنسی تجربے مجھے بے دھڑک سنایا کرتی، جن کے متعلق مجھے کوئی گیان نہ تھا۔ میں حیرت کا مارا سوچا کرتا کہ پُرش اور ناری کے درمیان کیا ایسا بھی ہوا کرتا ہے کہ وہ اخلاقیات کی ہر حد کو پار کر جاتے ہیں؟ میں بیلا کی نظر میں ایک ایمان دار صحافی، مستند دانشور اور بے داغ شخص تھا۔ مگر میں اُس سے زیادہ ملاقاتیں کرنے میں بدکتا تھا، اس لیے کہ وہ شراب کی دلدادہ تھی۔ جم کر پیتی تھی اور جم کر پلاتی بھی تھی۔ مگر میں پینے پلانے کا زیادہ شوقین نہ تھا۔ ڈاکٹروں نے اُسے شراب پینے سے منع کر رکھا تھا کہ وہ اس کے واسطے زہر تھی۔ مدت سے وہ ایک گُپت روگ کا شکار بھی تھی۔ جان لیوا جراثیم اُسے گاہے گاہے تنگ کیا کرتے، مگر وہ پینے پلانے سے پھر بھی باز نہ آتی۔ میں اُس کو روکنے کی کوشش کرتا تو وہ لبوں سے گلاس ہٹا کر کہتی:

''سنو راجکمار! تم کیا جانو شراب کیا ہے؟ اِس کی مہربانی سے میں اپنا بچپن، جوانی اور آج کا دن بھی بھول جاتی ہوں ......اور یہ بھی غور سے سنو! میں جتنی جلدی چلی جاؤں اتنا اچھا ہے۔ یہ دنیا بڑی گھناؤنی ہے۔ یہاں بھگوان بھی پیسے کے آگے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔''

وہ جس میز پر بیٹھی ہوئی تھی، مجھ سے دور نہ تھی۔ وہ مجھ کو دیکھ کر اپنائیت سے مسکرا دی، مگر میں نے انجان بن کر منہ پھیر لیا کہ اُس کے قریب جانے پر کہیں وہ بھی مجھ کو پرورٹ نہ کہے؟ اور میرا کھولتا ہوا لہو مزید کھول کر رہ جائے۔ مگر وہ دل چھوٹا کرنے والوں میں سے نہ تھی، اُٹھ کر میرے پاس چلی آئی۔ اپنائیت سے بولی:

''منہ کیوں پھیر رہے ہو راجکمار، میں تمھارے بارے میں سب جان چکی ہوں۔''

یہ سننا تھا کہ میری گردن جھک کر میز میں دھنس گئی۔ بیلا میرے سامنے بیٹھ گئی۔ میں نروس ہو گیا۔ اچانک اُس کے بول میرے کانوں سے ٹکرائے:

''مایا تم کو پرورٹ کہتی ہے ناں؟''

میری جھکی ہوئی گردن اُس کے طنزیہ قہقہے پر دھیرے دھیرے اُٹھی۔

''......وہ سالی تو خود پرورٹ ہے......ایسے ایسے جنسی تجربے حاصل کر چکی ہے جو میں نے بھی نہیں کیے۔''

میں ہونقوں کی طرح اُس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

''تم نے مایا سے دلچسپ سوال پوچھا تھا۔ اُس کا جواب میرے پاس ہے.....چلو اُٹھو، میرے گھر چلو......میں تمھارے سوال کا جواب دوں گی۔''

اُس نے جس اعتماد اور ایمانداری کے ساتھ کہا تھا۔ میں کانپ اُٹھا۔ ڈاکٹر، انجکشن، گولیاں، ہسپتال میرے تصور میں گھوم کر رہ گئے۔ اُس نے میرے چہرے اور آنکھوں سے میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔ اُس کے جاندار قہقہے پر آس پاس کے بیٹھے ہوئے لوگ اور رقصاں جوڑے مڑ مڑ کر ہمیں دیکھنے لگے۔ مگر اُس کا قہقہہ کسی بھی طور کم ہونے میں نہ آیا۔ اُس نے میری دور اندیشی کو بھی ننگا کر ڈالا تھا، اور میں ملبوس ہو کر بھی اُس کے سامنے برہنہ ہو چکا تھا۔ میری گردن اتنی ڈھلک گئی تھی کہ آئندہ شاید ہی وہ کبھی اُس کی صحبت میں اُٹھ پائے گی۔

میں تھکا ماندہ، ٹوٹا پھوٹا، دل برداشتہ اپنے کیبن میں داخل ہوا۔ بلب روشن کیے بغیر ڈھے سا گیا۔ اندھیرا میرا مقدر بن چکا تھا۔ پورا یقین ہو چکا تھا کہ سوال پوچھنے کی سزا مجھ کو اتنی سخت ملی ہے کہ مایا کے ساتھ تعلقات ختم ہو کر رہ گئے ہیں۔ بحال ہونے کے امکانات بھی جاتے رہے۔ اب سفر تن تنہا ہی طے کرنا ہوگا، جو یقیناً اذیت ناک ثابت ہوگا۔ شامیں اور راتیں الگ سے پریشان کریں گی۔ اچانک پڑوس کے کیبن سے پیار محبت کی میٹھی میٹھی سرگوشیاں، بوس و کنار کی ہلکی ہلکی آوازیں اُبھریں۔ اُن کا بڑھنا فطری امر تھا۔ میں فوراً ہی بستر سے چھلانگ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک آنکھ بند کیے سوراخ سے PEEPING TOM بنا ساتھ والی کیبن میں جھانکا۔ برہنہ جوان بدن سانپ کی طرح لپٹے ہوئے ساری دنیا سے بے خبر تھے۔ وہ ایک دوسرے کو اپنے ہونٹوں، ہاتھوں اور زبان سے کاٹ رہے تھے، چاٹ رہے تھے، محسوس کر رہے تھے اور سکون بھی پا رہے تھے۔ میں اُن کی ہر

ادا سے محظوظ ہوا جارہا تھا اور مجھے آنند بھی برابر مل رہا تھا۔ میرے تمام بدنی اعضا بیدار ہو چکے تھے۔ تناؤ اور تشنج بھی اُبھر آیا تھا۔ چیونٹیاں بھی منہ کھول بیٹھی تھیں۔ میری بھنچی ہوئی مٹھیاں اپنے آپ وا ہو گئیں۔ میں نے خود کو ٹٹولا اور گہرے اندھیرے میں خود کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ مایا ہنستی، میرا مذاق اُڑاتی قریب ہی کھڑی تھی مگر جلد ہی میں نے ایک زوردار جھٹکے سے اُس کے وجود کو ختم کر ڈالا۔

☆☆
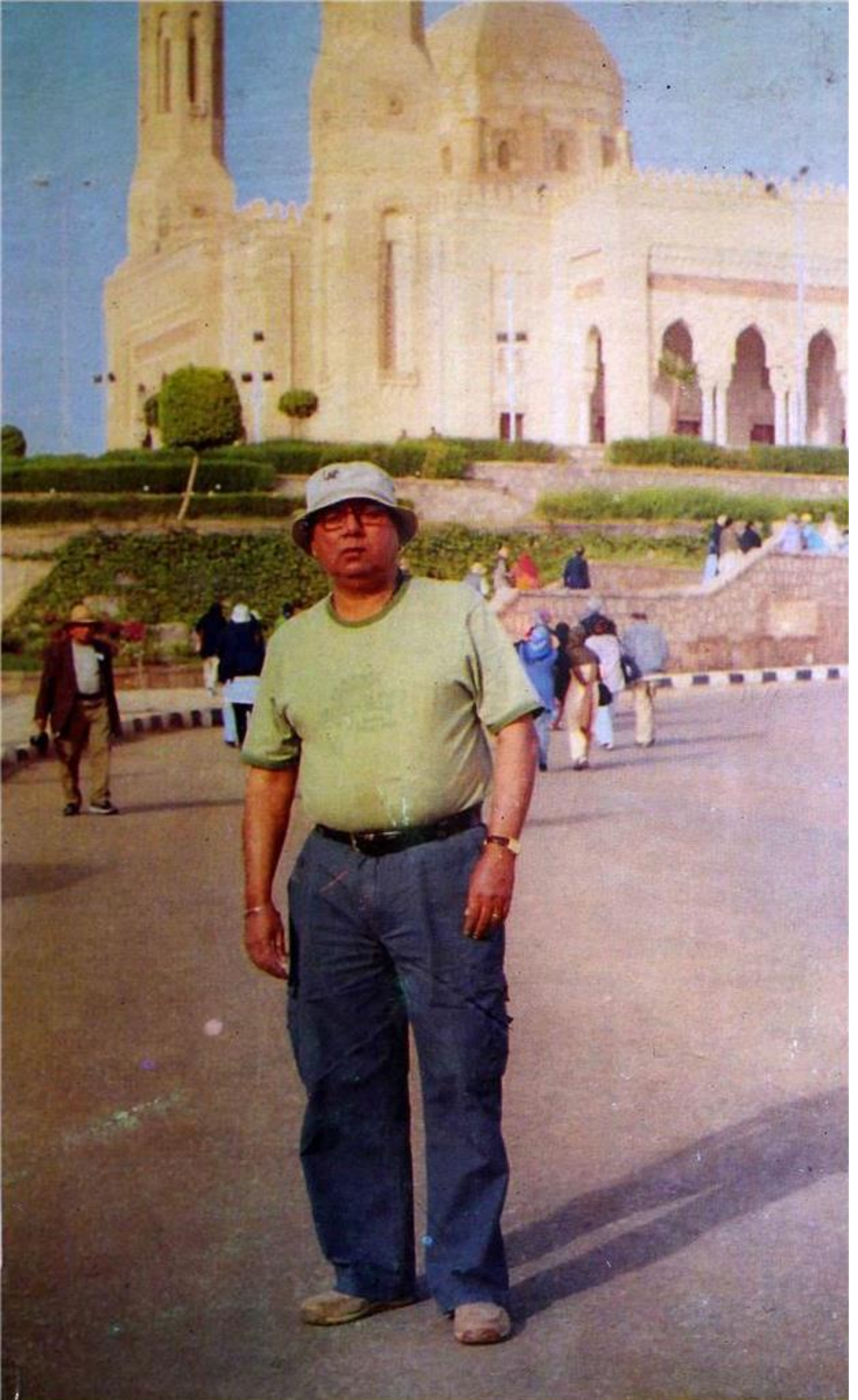
جتیندر بلّو مصر کے شہر لکسر (LUXOR) میں، مسجدِ اقصیٰ کے خطوط پر تعمیر کی گئی مسجد کے آگے